محی الدین نواب

لڑکیوں کی شادی ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ لڑکیاں جوان ہوتی ہیں تو ماں باپ ان کے لیے رشتے کی فکر کرنے لگتے ہیں، وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہمارے معاشرے میں ہر سطح پر مختلف نوعیت کا ہے۔ وہ لوگ بھی کسی نہ کسی طور اس سلسلے میں پریشان رہتے ہیں جو ہر قید وبند سے آزاد رہ کر جیتے ہیں اور اپنے اعمال کے سلسلے میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوتے اور ان کے لیے بھی یہ مختلف انداز میں آزار کا باعث بنتا ہے جو خاندانوں اور برادریوں کی حدود میں محدود ہیں۔ آئے دن بے شمار حادثات و جرائم محض اسی ایک مسئلہ کے سبب جنم لیتے رہتے ہیں۔ اس کا حل اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا سدِ باب تو اربابِ حل و عقد کی ذمہ داری ہے۔ ایک ادیب تو صرف اپنے بیمار معاشرے کے امراض کی نشان دہی ہی کر سکتا ہے۔ سو محی الدین نواب نے اس حوالے سے ہمیشہ زہر ہی پیا ہے۔

ذات پات اور برادریوں کے بندھن میں جکڑے ہوئے انسانوں کی کہانی — نواب کی شعبدہ بیانی

میں سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ سر اٹھا کر چاند کو دیکھا جاتا ہے یا بام پر آنے والے محبوب کا دیدار کیا جاتا ہے۔ ویسے دونوں ہی باتیں تھیں۔ وہ چاند جیسا چہرہ تھا لیکن بام پر نہیں تھا۔ رسی کے ایک پھندے سے لٹک رہا تھا۔

آہ! یہ کمال کا حسن اور ایسی بے قدری! مایوسی اور موت تو ایسی لڑکیوں کے لیے ہوتی ہے جنہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اگر وہ مرنے سے پہلے آئینہ دیکھ لیتی تو اپنے حسن و شباب پر ناز کرتی۔ جنگل میں مور ناچتا ہے۔ وہ خوشی سے جھوم کر کسی کے بازوؤں میں جھول جاتی مگر پھانسی پر نہ لٹکتی۔

میں سی آئی ڈی ڈیپارٹمنٹ کا ایک چیف آفیسر ہوں۔ میرا نام طارق جمال ہے۔ مجھے ایک سراغ رساں کی حیثیت سے اس کی موت کے اسباب معلوم کرنے چاہئیں لیکن مجھے حسن اور شاعری سے بھی لگاؤ ہے۔ میں قتل یا خودکشی کا مسئلہ حل کرتے کرتے حسین لڑکیوں کے متعلق الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہوں۔ ویسے یہ کوئی بری عادت نہیں ہے۔ میں اکثر الٹی سیدھی باتیں سوچتے سوچتے کسی پیچیدہ واردات کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔

میرا ساتھی افسر اس لٹکتی ہوئی لاش کے چاروں طرف گھومتا ہوا اسے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو! دیکھو! یہ برا نہیں ماننے گی۔"

وہ چونک گیا پھر ناگواری سے بولا۔ "مسٹر جمی! میں اس قدر سنجیدہ معاملات میں مذاق برداشت نہیں کرتا۔ یاد رکھو تم عہدے میں برابر ہو سکتے ہو مگر عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو۔ میں تجربات میں تم سے بہت زیادہ سینئر ہوں۔ کسی جونیئر کی بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔"

میں نے اوپر دیکھا۔ پھر چونک کر کہا۔ "ایسے آنکھ مارتی ہے۔"

وہ اپنی جھینپ بھول کر فوراً ہی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ پھندے سے جھول رہی تھی۔ ڈیلے پھیل گئے تھے۔ ہونٹ بھی کھلے ہوئے تھے۔ کبھی وہ چہرہ مسکراتا ہوگا۔ اب اس اجلی صورت پر موت کا کرب رہ گیا تھا۔ میرے ساتھی افسر نے پھر مجھے غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے کیا کہا تھا؟"

میں نے معصومیت سے کہا۔ "مجھے ایسے لگا جیسے اس مرنے والی نے اپنی پلکیں جھپکائی ہوں یا شاید اپنی ایک آنکھ دبائی ہو۔"

وہ غصے کے مارے دو قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔ "میرا نام جمشید ہزاروی ہے۔ اعلیٰ افسران بھی میری بزرگی کو دیکھتے ہوئے احترام کرتے ہیں اور تم مجھے جمی سمجھ کر ایسی بے تکی باتیں کر رہے ہو۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ مر چکی ہے۔ اس نے تمہیں آنکھ کیسے"

"بھائی جمشید ہزاروی! یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کیوں ناحق ہو

وہ منہ پھیر کر دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی مٹھیاں بھینچی
ہوئی تھیں۔ وہ ضبط برداشت کر رہا تھا۔ پھر پلٹ کر بولا۔ "میں اعلیٰ افسران
سے شکایت کروں گا جو اس کیس کو ... نہیں کرنے دیں گے۔
میں تمہیں ابھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم مجھے ... واردات کی
وجہ سے بچنے کا موقع نہیں دو گے اور وہ اس کے اہم پہلوؤں پر غور کرتے
ہوئے بجائے انسپکٹر کے سامنے اپنی ذہانت کا ثبوت دے سکو گے ... میں
منہ دیکھتا رہ جاؤں گا۔"
"اگر آپ کو میرا خلوص اور میری نیت پر ذرا بھی شک ہے تو میں آپ
کو چھوڑ دیتا ہوں۔ پھر آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔"
"جب باہر جا رہا تھا تو اندر کیوں آئے تھے؟"
"اس خیال سے کہ آپ تو تنہا ایک لڑکی کے ساتھ کمرے میں
نہیں رہنا چاہتے۔ وہاں آپ ذرا سی بات کا فسانہ بنا دیتے ہیں۔"
اس نے پلٹ کر ... پھر وہ اس
غصے سے گھورتا ہوا مجھ پر ... وہ مجھ پر ہاتھ
نہیں اٹھا سکتا تھا اور نہ ہی منہ سے گالیاں نکال سکتا تھا۔ میں مسکراتا
ہوا باہر آگیا۔

جائے واردات کے فوٹو گرافر اور فنگر پرنٹ والے اپنا کام کر کے
جا چکے تھے۔ باہر بھی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پولیس والے تماشا دیکھنے والوں
کو دور ہٹا رہے تھے۔ میں رمضو قصائی کے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔
وہ خالی خالی آنکھوں سے خلا میں تک رہا تھا جیسے بیٹی کو وہاں بھی ڈھونڈ رہا
ہو ... جب اسے احساس ہوا کہ ایک افسر اس کے
پاس آکر بیٹھ گیا ہے تو وہ جلدی سے اٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے
سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

وہ پچپن سال کا باپ تھا۔ اس کی اچھی خاصی عمر ہو گئی تھی اس
کے باوجود اس کے ہاتھ سخت اور مضبوط تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھری
ہوئی تھیں۔ سینہ چٹان کی طرح لگتا تھا۔ آج بھی پہلوانوں جیسا دکھائی
دیتا تھا۔ میں نے پوچھا: "آج سے کوئی چار ماہ پہلے تمہاری بڑی بیٹی بھی
جل کر مر گئی تھی؟"

وہ پھر خلا میں تکنے لگا۔ اپنی جلتی ہوئی بیٹی کو شعلوں میں لپٹا
ہوا دیکھ رہا ہو گا۔ اس کی چیخیں سن رہا ہو گا۔ میں نے معذرت چاہتے
ہوئے کہا: "سوری! میں تمہارے پچھلے زخم کو کریدنا نہیں چاہتا۔ میں
نے کچھ سوچ کر ہی یہ سوال کیا تھا۔ جانے کیوں مجھے تمہاری دونوں بیٹیوں
کے ذکر پر ... کی وہ تین بہنیں یاد آ گئیں جنہوں نے ایک ہی دن ایک
ہی کمرے میں ایک ہی وقت پھندے سے لٹک کر جان دے دی تھی۔ شاید
تم نے بھی اخبارات میں ان تینوں کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ انہوں نے
مرنے سے پہلے اپنے باپ کے نام پرچی لکھی تھی کہ اب آپ کو ہمارے جہیز
کے لیے فکر مند نہیں رہنا پڑے گا صرف کفن کا بندوبست کر دیجیے۔"
رمضو قصائی نے ایک زور کا گھونسا اپنے سینے پر مارا۔ پھر روتے

ہوئے کہنے لگا: "میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں،
قصائی ہوں۔ میری آنکھ سے کبھی آنسو نہیں نکلے گا۔ آج میری دوسری
بیٹی نے خود کو پھانسی پر لٹکا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ میری پہلی بیٹی کی موت
حادثے سے نہیں ہوئی۔ اس نے بھی جان بوجھ کر جان دی تھی۔"
"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہاری بڑی بیٹی نے بھی خودکشی کی تھی؟"
"ہاں۔ پہلے میں نے بیان دیا تھا کہ وہ کھانا پکا رہی تھی۔ چولہے
پر ... تیل کا چولہا پھٹ گیا۔ وہ آگ کے شعلوں میں لپٹ گئی۔ چیخنے
چلانے لگی۔ جب تک کوئی اس کی مدد کو پہنچا تب تک وہ اس قدر جل
چکی تھی کہ ہسپتال پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیا تھا۔"
"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان لڑکیوں کا رشتہ نہیں آ رہا تھا یا یہ
پاکستانی بیٹیاں بھی ان ہندوستانی بہنوں کی طرح جہیز کی لعنت سے نجات
حاصل کرنے کے لیے جان دے چکی ہیں؟"
"جی ہاں۔ میری بچیوں نے مجھ مجبور باپ کو جہیز کی فکر سے
آزاد کر دیا ہے۔"
"میں نے تو سنا ہے کہ آپ اچھا خاصا کما لیتے ہیں اور چار پیسے
بھی جوڑتے ہیں۔ کسی کے محتاج نہیں رہتے۔"
"جناب انسپکٹر صاحب! وہ زمانہ لد گیا جب قصائی ایک محدود
زندگی گزارتے تھے۔ آج قصائیوں کے لڑکے بھی جہیز مانگتے ہیں۔ جہیز
میں ٹی وی، وی سی آر اور ایئر کنڈیشنر اب کوئی بڑی بات نہیں رہی۔
وہ تو سوسائٹی میں پوزیشن کا مطالبہ کرتے ہیں۔"
جس کمرے میں اس کی بیٹی نے خودکشی کی تھی اس کمرے کے
دروازے پر لکھا ہوا تھا "مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔"
میں نے پوچھا: "تم اپنا یہ مکان کرائے پر اٹھانا چاہتے ہو؟"
"ہاں، چاہتا تھا مگر اب کرایہ دار کون آئے گا۔ یہ مکان تو آسیب زدہ
ہو گیا ہے۔"
"کیا گھریلو ضروریات سے مجبور ہو کر کرائے پر اٹھانا چاہتے ہو؟"
"میں اتنا دولت مند نہیں ہوں کہ لڑکے والوں کا مطالبہ پورا کر سکوں
اور اتنا غریب اور بے بس نہیں ہوں کہ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے
لیے مکان کا یہ حصہ کرائے پر اٹھا دوں۔ دراصل میری لڑکیاں اپنی نانی کے
ساتھ یہاں رہتی ہیں بلکہ رہتی تھیں۔ اب تو ایک ہی بیٹی رہ گئی ہے۔
ان کے لیے مکان کا پچھلا حصہ کافی ہے۔ میں نے سوچا یہاں اگلے
حصے میں کرایہ دار آ جائیں تو ماہانہ کم از کم ہزار روپے ملتے رہیں گے اور
یہاں کوئی خاندان آکر آباد ہو گا تو میری بیٹیوں کو تنہائی کا احساس
نہیں ہو گا۔"
"کیا تم ان کے ساتھ نہیں رہتے؟"
"میں دوسرے مکان میں دوسری بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔"
"میں مانتا ہوں تمہارے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ بیٹیوں کا
جہیز پورا کر سکو کیا اتنی رقم ہے کہ دوسری بیوی کے اخراجات برداشت

کر سکو؟"
"آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں نے بہت مجبور ہو کر شادی کی ہے۔"
"کیسی مجبوری؟"
"میری دوسری بیوی کے گھر والوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں شادی
کروں تو میری دوسری بیوی کے بھتیجے سے میری بڑی بیٹی کی شادی کر
دی جائے گی۔ میری برادری والوں نے سمجھایا: اچھا موقع ہے تو دوسری
شادی کرنے کے بعد ہی ان کے ساتھ باپ سے جہیز نہ مانگو۔ پھر وہ لوگ
بھی تمہاری بیٹی کے ساتھ جہیز کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ میں راضی ہو گیا۔
شرط یہی تھی کہ پہلے میں شادی کروں۔ سو میں نے کر لی۔"
"اور وہ جو برادری والوں نے تمہاری بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا؟"
اس نے جواب دیا: "ہم لوگ زبان کے دھنی ہوتے ہیں جو کہتے
ہیں اسے جان دے کر بھی پورا کرتے ہیں۔ لیکن آج کی نسل جانے کس راہ پر
چل رہی ہے۔ سگریٹ کا ایک کش لگا کر بزرگوں کی روایات کو ایک
پھونک میں اڑا دیتی ہے۔ میری بیٹی کے ساتھ جو شادی کرنے والا تھا
وہ لندن میں رہنے والی ایک پاکستانی فیملی کے دام میں آگیا۔ اسے لالچ
دیا گیا کہ وہ ان کی بیٹی سے شادی کرے گا تو اسے لندن میں اچھا کاروبار
کرا دیا جائے گا۔"
وہ ذرا چپ ہوا۔ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ "آہ! اب مجھے یاد
آ رہا ہے جس دن وہ یہاں سے لندن گیا اس کے دوسرے دن ہی میری
بیٹی جل کر مر گئی تھی۔ اب اس کی موت کا سبب میری سمجھ میں آ رہا ہے۔"
ہم سڑک کے دوسرے کنارے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔
وہ فراخ، کشادہ سڑک تھی لیکن ویران تھی۔ وہاں بہت کم ٹریفک نظر آتا
تھا۔ سڑک کے دوسری طرف رمضو قصائی کا مکان تھا۔ اس مکان کا
دروازہ کھلا، دو سپاہی اسٹریچر پر اس لڑکی کی لاش کو ڈھانپ کر باہر
لائے۔ ہم سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس لاش کو ایک گاڑی میں
پیچھے رکھا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا تمہاری دوسری بیٹی کے ساتھ بھی
ایسا ہی کچھ ہوا ہے؟"
وہ دور اپنی بیٹی کی لاش کو دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ اپنے سینے
پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس گاڑی کے پچھلے حصے کو بند کر دیا گیا تھا۔ اب ہمیں
وہاں سے جانا چاہیے تھا لیکن ابھی بہت سے سوالات جواب طلب تھے۔
اور جمشید ہزاروی بھی دور کھڑا مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
یقیناً سوچ رہا ہو گا کہ میں مقتولہ کے باپ سے نہ جانے کیسی قیمتی معلومات
حاصل کر رہا ہوں جن کے ذریعے میں اس سے پہلے ہی اس کیس کے
پیچیدہ معاملات کو سلجھا لوں گا۔
اس نے ایمبولینس میں اپنے ایک ماتحت کو اور سپاہیوں کو روانہ
کر دیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
"کیا تم نے رمضو کا بیان لیا ہے؟"
"یونہی گفتگو کر رہا ہوں۔ باقاعدہ تحریری بیان تھانے میں لیا جائے گا۔"

"ہاں، ہاں اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔ (دبی ہنسی ہنس کر) اور تم
رمضو میرے ساتھ آؤ اور یہ بتاؤ کہ تمہاری بیٹی پھانسی کے پھندے تک
کیسے پہنچی؟"
رمضو نے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا: "چلو۔"
ہم تینوں اسی کمرے میں آئے جہاں پنکھے پر پھندے سے اس کی بیٹی
پھندے سے لٹک رہی تھی۔ وہ بڑا سا کمرہ بالکل خالی تھا۔ جمشید
ہزاروی نے پوچھا: "کیا یہ کمرہ ہمیشہ خالی رہتا ہے؟"
"جی ہاں۔ آپ نے باہر بورڈ دیکھا ہو گا یہ کرائے کے لیے
خالی ہے اور اب شاید آئندہ بھی خالی رہے گا۔"
"کیوں خالی رہے گا؟"
"جہاں قتل کی واردات ہو جائے وہاں کرائے دار نہیں آتے۔"
"ہاں، ہاں اتنا تو میں بھی جانتا ہوں، مجھے بچوں کی طرح سمجھاؤ
ذرا غور سے میری بات سنو۔ ہمارے آدمیوں نے ناپ کر دیکھا ہے
چھت کی اونچائی چودہ فٹ ہے اور چھت کے شہتیر سے پھندا
چھ فٹ نیچے تک لٹک رہا ہے۔ باقی فرش تک آٹھ فٹ
جگہ خالی ہے۔ تمہاری بیٹی آٹھ فٹ بلندی تک کسی چیز کے بغیر
پھندے تک کیسے پہنچ گئی؟ اس کمرے میں کوئی کرسی، بیٹھنے یا
چڑھنے کی تپائی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ پھندے تک کیسے پہنچی
ہو گی؟"
"جناب! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں چھوٹے دماغ کا آدمی ہوں۔
میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ چھرا کام کرتا ہے۔ میں گوشت کا قیمہ
بنانا اور ہڈیاں توڑنا جانتا ہوں۔ کوئی بھی پیچیدہ معاملہ ہو میری سمجھ
میں نہیں آتا۔ اگر سمجھ میں آتا تو آج دوسری بیٹی خودکشی کیوں کرتی؟"
جمشید ہزاروی نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بڑی شان سے مجھے
دیکھتے ہوئے کہا: "مسٹر جمیل! میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ میں یہ
ثابت کر دوں گا کہ یہ خودکشی نہیں بلکہ قتل کا کیس ہے۔ کسی نے اس لڑکی
کو قتل کیا ہے۔"
رمضو چونک گیا۔ اس نے ایک بار جمشید ہزاروی کو دیکھا پھر
مجھے دیکھتے ہوئے بولا: "کیا میری بیٹی کو قتل کیا گیا ہے؟"
میں نے کہا: "اس خالی کمرے کو دیکھ کر کوئی اناڑی جاسوس بھی
یقین سے کہہ سکتا ہے کہ یہ خودکشی نہیں قتل کا کیس ہے۔"
پھر میں نے جمشید کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا: "اتنی سی بات
کے لیے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا ضروری نہیں ہے۔"
اس نے ناگواری سے پوچھا: "کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ قتل کا کیس
کیسے ہے؟"
رمضو نے بھی مجھ سے کہا: "جناب! یہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اگر
کسی نے قتل کیا ہے تو وہ یہاں سے باہر گیا ہو گا۔ جب باہر گیا ہو گا تو یہ
اندر سے کس طرح بند ہو گیا؟ آپ لوگ اسے توڑ کر اندر آئے ہیں۔"

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے پاس گیا، پھر اس نے مڑ کر دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا: "اس دروازے میں اندر کی طرف دو چٹخنیاں لگی ہیں، ایک بالکل اوپر اور ایک درمیان میں۔ نیچے والی چٹخنی کے نیچے چوکھٹ میں ایک سوراخ ہے۔ اگر دروازہ بند کرنے سے پہلے چٹخنی کو نیچے گرا دیا جائے اور دروازے کو آہستہ آہستہ بند کیا جائے تو چٹخنی چوکھٹ کے سوراخ میں جا کر پھنس جائے گی، پھر باہر سے کوئی کھول نہیں سکے گا۔"

پھر میں نے جمشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مسٹر جمشید! بے چارے قاتل کی ایک مجبوری تھی۔ وہ اس دروازے کی اوپری چٹخنی نہیں لگا سکتا تھا۔"

جمشید نے پوچھا: "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اوپری چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی؟"

"یہاں آ کر میں نے بھی اس دروازے کو توڑنے کی کوشش کی تب میں دروازے کو باہر سے دھکے مار رہا تھا تو اس دروازے کا اوپری حصہ ہل رہا تھا اور نیچے کا حصہ مضبوطی سے اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ اگر اوپری بھی چٹخنی لگی ہوتی تو وہ اوپری حصہ بھی نہ ہلتا، اپنی جگہ مضبوطی سے جما رہتا۔"

جمشید ہزاروی نے خوش ہو کر کہا: "شاباش، تم میری صحبت میں رہ کر بہت کچھ سیکھ رہے ہو۔"

میں نے سوچا یہ خوامخواہ اپنی برتری جتا رہا ہے اسے چکر دینا چاہیے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا: "لیکن بزرگو! یہ قتل کا نہیں خودکشی کا کیس ہے۔ لڑکی نے اپنی مرضی سے جان دی ہے۔"

وہ حقارت سے بولا: "لاحول! یہ بکواس ہے۔"

"میں ثابت کروں گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے، لڑکی نے جان کیوں دی اور اس کا جواب لڑکی کا باپ ہی دے سکتا ہے۔"

رمضو نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا: "جناب! میں نے اپنے تمام حالات بیان کر دیے۔ اب کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔"

"بہت کچھ کہنے کے بعد بھی بہت کچھ کہنے کو رہ جاتا ہے۔ تمہاری بڑی بیٹی کا نام ماجدہ تھا وہ جل کر مر گئی اور جو پھانسی پر لٹک گئی اس کا نام خالدہ تھا اور تمہاری تیسری بیٹی کا نام ساجدہ ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ تیسری بھی کسی ایسے انجام تک پہنچے؟"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا: "نہیں، اس سے پہلے ہی میں اپنی بیٹی کو برادری کے باہر بیاہ دوں گا۔ کسی بھی غریب لڑکے کو پکڑ کر اس کے ہاتھ میں بیٹی کا ہاتھ دے دوں گا۔ اب میں برادری کی پروا نہیں کروں گا۔"

جمشید ہزاروی نے مجھ سے کہا: "تم اس کے گھریلو معاملات میں کیوں الجھ گئے ہو۔ صرف واردات سے متعلق سوال کرو۔"

میں نے کہا: "میں واردات کے متعلق سوالات کرنے کے لیے گھریلو معاملات کو الجھا رہا ہوں۔ لیکن رمضو! کیا تمہاری دوسری بیٹی خالدہ کا رشتہ کہیں سے آیا تھا؟"

"آپ ایک رشتے کی بات پوچھتے ہیں، یہاں تو کئی رشتے آتے ہیں۔ میری بیٹیاں صورت شکل میں اور تعلیم و تربیت میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر ان سے مل کر، ان سے باتیں کر کے یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ کسی قصائی کی بیٹیاں ہوں گی۔"

میں نے کہا: "یہ تم بتا چکے ہو اور ہم اس بات کو مانتے ہیں۔ آجکل موچی ہوں، حجام ہوں، قصائی ہوں، اب وہ چھوٹے لوگ نہیں ہیں۔ ایسے پیشوں سے تعلق رکھنے والے اب اپنی اولادوں کو تعلیم دلا رہے ہیں، انہیں ملک سے باہر بھیج رہے ہیں، جو وہ ذکر ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے کر رہے ہیں اور انہیں ساری دنیا دکھا رہے ہیں۔ لیکن تعجب ہے، ان کے پڑھے لکھے لڑکے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا اتنے باشعور نہیں ہیں کہ کوئی تم سے جہیز کا مطالبہ نہ کرے؟"

اس نے کہا: "صاحب! آپ کا طبقہ ہم سے زیادہ باشعور، معزز اور مہذب کہلاتا ہے۔ کیا آپ کے ہاں جہیز کا مطالبہ کرنے والوں کی اکثریت نہیں ہے؟"

"ضرور ہے لیکن ڈھونڈنے سے ایسے لڑکے مل جاتے ہیں جو صرف لڑکی کے ساتھ گھر بسانا چاہتے ہیں، اس کے باپ کو لوٹنا نہیں چاہتے۔"

"صاحب! آپ ڈھونڈنے کی بات کرتے ہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں، ڈھونڈنے سے خدا مل جاتا ہے لیکن ایک بیٹی کے باپ کو نیک بخت داماد نہیں ملتا۔"

جمشید ہزاروی نے ناگواری سے کہا: "تم پھر اس کے گھریلو مسائل میں الجھ رہے ہو۔"

میں نے تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا: "مسٹر جمشید! خاموش رہو۔ کوئی بھی جرم گھر کی اور معاشرے کی خرابی سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا مجھے گھر کی بات کرنے دو۔ ہاں تو رمضو! یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ڈھونڈنے سے بھی تمہیں کوئی نیک بخت داماد نہیں ملا اور جب نہیں ملتا ہے تو پھر ایک دوسری بات ہوتی ہے۔ تم برا نہ مانو لڑکیاں ایسے میں گمراہ ہو جاتی ہیں۔"

"میری بیٹیاں ایسی نہیں تھیں۔"

"دنیا کے تمام ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق نیک خیالات رکھتے ہیں۔ یہ بتاؤ تمہاری بڑی بیٹی ماجدہ کی عمر کیا تھی؟"

"پینتیس سال۔"

"دوسری بیٹی خالدہ کی عمر کیا تھی؟"

"تیس برس۔"

میں نے کہا: "وہ تیس برس تک کسی رشتے کا انتظار کرتی رہی۔ ایک جیون ساتھی کا تصور کرتی رہی، اسے خوابوں میں دیکھتی رہی۔ آنکھ کھلنے کے بعد چونک چونک کر دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ رمضو! ایک لڑکی کی زندگی میں تیس برس بہت ہوتے ہیں۔ ان برسوں میں اس کی ہر نظر دروازے پر ہوتی ہے اور اس کے کان ہر آہٹ سن کر چونک جاتے ہیں۔ ایسے میں وہ کسی بھی آنے والے کو قبول کر لیتی ہے یا اسے اپنی تنہائیوں میں بلا لیتی ہے۔"

وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ کر مجھے غصے سے دیکھتے ہوئے بولا: "خبردار! میری مرنے والی بیٹی کو الزام نہ دینا، میں اسے برداشت نہیں کروں گا۔"

میں نے پوچھا: "اگر یہ الزام نہ ہو تو برداشت کر لو گے؟"

وہ مجھے چبھتی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا: "یہ کمرا خالی ہے، تم نے اسے کرائے کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری بیٹی مکان کے اگلے حصے سے نکل کر اس خالی کمرے تک کیسے آئی تھی؟ کیوں آئی تھی؟ کیا کسی نے اسے بلایا تھا یا وہ خود کسی سے ملنے آئی تھی یا اس کا دماغ چل گیا تھا وہ پاگل ہو گئی تھی کہ یہاں آ کر اس نے چھت کے شہتیر سے پھندا لٹکایا اور اپنے گلے میں ڈال کر مر گئی؟"

اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تھے، انکار میں سر ہلاتا جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ کہتا جا رہا تھا: "میری بیٹی کو الزام نہ دو، وہ بدچلن نہیں تھی۔ ایک باپ کی غیرت یہ برداشت نہیں کرے گی۔ خدا کے لیے دوسری بات کرو۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا: "ابھی بات بننے میں یہ بات نہیں کروں گا۔ یہ بتاؤ، مکان کے دوسرے حصے میں کتنے افراد ہیں؟"

"میری ایک بیٹی اور اس کی نانی ہیں۔"

"تم جاؤ اور ان سے کہو میں ان کے بیانات لینے آ رہا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ میں نے جمشید کو دیکھتے ہوئے کہا: "آپ کو اس بات پر اعتراض تھا کہ میں اس کے گھریلو مسائل میں الجھ رہا ہوں۔ اب آپ کی سمجھ میں آیا ہو گا کہ خودکشی یا قتل کی واردات جو گھر میں ہوتی ہے اس کا تعلق گھر والوں سے اور گھر والوں کے مسائل سے ضرور ہوتا ہے۔ آپ جیسے بزرگوں کو ہم نوجوان افسروں سے ایسی باتیں ضرور سیکھنی چاہئیں جو بڑھاپے میں عقل سکھاتی ہوں۔"

میں پلٹ کر جانے لگا۔ اس نے کہا: "ٹھہرو، تم مجھ سے دو ٹوک باتیں کر کے نہیں جا سکتے۔ پہلے تم نے کہا یہ قتل کا کیس ہے پھر مجھے جھٹلانے کے لیے کہنے لگے یہ قتل کا نہیں خودکشی کا کیس ہے۔ اس کے بعد پھر تم نے بات بدل دی۔ اس کے باپ سے کہہ رہے تھے کہ لڑکی رات کو یہاں کسی سے ملنے آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے اس کا کوئی عاشق تھا یعنی اس خودکشی یا قتل کے کیس میں ایک عاشق کی گنجائش نکل آئی ہے۔"

"یقیناً میں نے یہ کہا ہے، ان حالات میں لڑکیاں گمراہ ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ بھی بھٹکنا چاہتی ہیں یا بھٹکنا چاہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پھانسی پر لٹکنے والی لڑکی کسی کے ساتھ یہاں آئی ہو۔ ہو سکتا ہے تیس برس تک جوانی کی آگ میں جلتے جلتے ذہنی مریضہ بن گئی ہو۔"

جمشید نے جھنجھلا کر کہا: "اے تم کیسے آفیسر ہو کہ کوئی ایک بات کیوں نہیں کہتے۔ کسی ایک فیصلے تک کیوں نہیں پہنچتے؟"

"کسی ایک فیصلے تک پہنچنے کے لیے مختلف پہلوؤں کو دیکھنا اور ٹٹولنا پڑتا ہے۔ ویسے میں ایک نتیجے تک پہنچ چکا ہوں۔"

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا: "وہ کیا ہے؟"

میں نے کہا: "لڑکی کا ایک عاشق ضرور ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں اس سے ملنے آئی ہو لیکن وہ پھانسی پر لٹکنے والی بہت ہی پاکباز لڑکی تھی۔ یہاں رات کی تنہائی میں جو بھی اس سے ملنے آیا تھا وہ کوئی گنہگار نہیں تھا۔"

اس نے جھنجھلا کر پوچھا: "تو پھر وہ ایک نوجوان لڑکی کے پاس کیوں آیا تھا؟"

میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا: "وہ یہاں اندر آیا۔ اس نے لڑکی کو اپنے کاندھے پر بٹھایا، اسے پھندے تک پہنچا کر اسے لٹکا کر دروازے تک آیا پھر دروازے کی چٹخنی نیچے گرائی اور دروازے کو بند کر دیا، چٹخنی اندر سے بند ہو گئی اور وہ چلا گیا۔"

جمشید ہزاروی پریشان ہو کر اس خالی پھندے کو دیکھنے لگا جو ابھی تک شہتیر سے لٹک رہا تھا۔ نیچے آٹھ فٹ خالی جگہ تھی اور وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا: "یہی ہو سکتا ہے، یہاں کوئی میز یا کرسی نہیں تھی، کسی نے اسے کاندھے پر بٹھا کر پھندے تک پہنچایا ہو گا۔"

میں اسے پریشان حال چھوڑ کر مکان کے دوسرے حصے میں آیا۔ دروازے پر دستک دی۔ رمضو نے دروازہ کھول کر کہا: "آئیے تشریف لائیے۔"

اندر صوفے پر ایک بوڑھی خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے سلام کیا۔ رمضو نے کہا: "یہ میری ساس ہیں، ساجدہ کی نانی۔"

وہ اپنے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ میں نے کہا: "رمضو! ہمیں تنہا چھوڑ دو۔"

وہ کمرے سے چلا گیا۔ میں نے ایک قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا: "محترم خاتون! جو کچھ ہوا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مجھے آپ لوگوں سے ہمدردی ہے لیکن میں یہاں صبر کی تلقین کرنے نہیں آیا ہوں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ دو بیٹیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تیسری کے ساتھ نہ ہو تو آپ میرے سوالات کا نہایت سوچ سمجھ کر جواب دیں۔"

"تم اتوار کی صبح کتنی دیر سوتے ہو؟"
"یہ تو منحصر ہے ......"
"کس چیز پر؟"
"وعظ کی طوالت پر۔"

تیسری نواسی کی رات میں نے کروٹ، روتے روتے جب رک گئیں، سسکیوں
پہ بستے آنچل بنا کر مجھے سونی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ میں نے پوچھا
"خالدہ بھی کمرے میں سویا کرتی تھی؟"
انھوں نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"اس کمرے میں دونوں بہنیں ساتھ سویا کرتی تھیں۔"
"آپ کہاں سوتی ہیں؟"
خاتون نے دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا۔ "اس دروازے کے پیچھے ایک راہداری ہے۔ راہداری کے آخری
سرے پر ایک کمرا ہے۔ میں اسی کمرے میں سویا کرتی ہوں۔"
"اور دعوتوں کا کمرا کون سا ہے؟"
"اسی راہداری میں ایک اور کمرا ہے لیکن وہ یہاں نہیں رہتا
ہے مجھے یہاں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ کوئی اسے ... بیٹی ہو تو یہاں ایک دن
کے لیے آجاتا ہے یا ایک رات گزار کر چلا جاتا ہے۔"
"کیا وہ پچھلی رات یہاں تھا؟"
"نہیں، میں نے اسے اطلاع بھیجی تھی کہ تمھاری دوسری بیٹی
بھی اپنی جان سے چلی گئی ہے تو وہ بدنصیب بھاگا چلا آیا۔"
"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ خالدہ نے اس خالی کمرے میں جاکر
خودکشی کی ہے؟"
"تھانیدار صاحب! آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کمرے میں
ایک کھڑکی بھی ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ وہاں سے گزرنے والوں
میں سے کسی نے دیکھا ہوگا کہ ایک لڑکی اندر شہتیر سے جھول رہی ہے۔
اس نے شور مچا دیا تھا۔ یہ بات میرے کانوں میں پڑی۔ میں بھاگی بھاگی
وہاں پہنچی۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے بند تھا۔ میں
نے کھڑکی کی جالیوں کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ خالدہ کو آوازیں
دیں لیکن وہ میری بات کا جواب کیسے دے سکتی تھی۔ وہ تو... وہ تو..."
وہ آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔ پھر آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ میں
نے انھیں تھوڑی دیر رونے دیا۔ پھر پوچھا "ان کا باپ کیسا ہے؟"
"وہ ایک غیرت مند اور فرض شناس باپ ہے۔ وہ میری بیٹی کے
مرنے کے بعد بھی دوسری شادی نہ کرتا۔ بڑی بیٹی کو دلہن بنا کر رخصت
کرنے کے بعد اس نے دوسری شادی کی مگر دھوکہ کھا گیا۔"
"ایک فرض شناس باپ آپ کی سرپرستی میں جوان بیٹیوں کو چھوڑ
کر دور رہتا ہے۔"
"وہ زیادہ دور نہیں رہتا۔ اسی محلے کی تیسری گلی میں ایک اور
مکان ہے جہاں دوسری بیوی اور دو چھوٹے بچے رہتے ہیں۔ یہاں
بیٹیوں کے پاس صبح شام آتا ہے۔ آدھی رات کو بھی کھانا کھا کر بیٹھو
تو دوڑا چلا آتا ہے۔ وہ بیٹیوں کو سونے کا نوالہ کھلاتا ہے مگر شیر
کی نظر رکھتا ہے کوئی ان پر میلی نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں پانچوں وقت
کی نماز پڑھتی ہوں۔ پھر دعا مانگنے کے وقت اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ہوں
مجھے دعوتوں کا ایک بخت دے اور خدا میری دعائیں سن کر نیک شوہر
کیوں نہیں ملتے؟"
وہ پھر رونے لگیں۔ میں نے کہا "آپ جا سکتی ہیں۔ اب میں
آپ کی نواسی سے کچھ سوالات کروں گا۔"
وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ میں سر جھکا کر سوچنے لگا۔ مجھے خالدہ کا
وہ عاشق کھٹک رہا تھا جس کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہ ہو
سکا تھا۔ لیکن یقین تھا کہ خالدہ کسی کو چاہتی تھی اور کسی سے ملنے کے لیے
مکان کے اسی حصے سے نکل کر اس خالی کمرے میں گئی تھی۔
ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے
دروازے پر ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس
کے سر پر آنچل تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھی مگر جھکی جھکی نظریں بتا رہی
تھیں کہ وہ صبح سے رو رہی ہے اور یہاں آنے سے پہلے اس نے
آنچل سے اچھی طرح آنکھیں پونچھ لی ہیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے
کہا "آؤ یہاں بیٹھو۔"
وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں
نے بھی بیٹھتے ہوئے پوچھا "تمھارا نام ساجدہ ہے؟"
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا "تم دونوں بہنیں
ایک کمرے میں سویا کرتی تھیں؟"
اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا "کیا تم اپنی
بہن سے بہت محبت کرتی تھیں؟"
اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا "کیا تم اس سے
کبھی جھگڑا نہیں کرتی تھیں؟"
اس بار اس نے آہستگی سے نظریں اٹھائیں۔ مجھے دیکھا
پھر کہا "کیا بہنوں میں جھگڑا نہیں ہوتا۔ یہ جھگڑے ہی تو محبت کو
اور زیادہ مستحکم بناتے ہیں۔ کیا جب ایک بہن دلہن بن کر ڈولی میں
بیٹھ کر رخصت ہوتی ہے تو دوسری جھگڑا کرنے والی بہن اس کے
لیے آنسو نہیں بہاتی؟ اس کی جدائی میں تڑپتی نہیں؟ میری بہن تو
دلہن بننے سے پہلے رخصت ہو گئی۔ میں کیسے بتاؤں کہ اس کے لیے
کیسے تڑپ رہی ہوں۔ کیا بتاؤں کہ میرے اندر کتنا دھواں بھرا ہوا
ہے۔ میں اس دھوئیں کو کس طرح نکالوں؟"
"میرا خیال ہے تم اچھی خاصی تعلیم یافتہ ہو۔ کوشش کرو تمھارے
اندر سے یہ دھواں نکل جائے۔"
"یہ نہیں نکلے گا۔ میرا دل کہتا ہے جل مرنے، پھندے سے
لٹکنے یا زہر پی لینے کے بعد ہی یہ نکل سکے گا۔"
"ساجدہ! تم باتوں سے تو سمجھدار لگتی ہو۔ کیا اس قدر دل برداشتہ
ہو گئی ہو کہ نادان لڑکیوں کی طرح مرنے کے متعلق سوچو گی؟"
اس نے پوچھا "کیا مرنے کے لیے موت کے متعلق سوچنا

ضروری ہے۔ کیا میری خالدہ باجی نے سوچا تھا کہ وہ مر جائیں گی۔ اگر
نہیں سوچا تھا تو پھر کیسے مر گئیں؟ وہ تو پچھلی رات بہت خوش تھیں۔
میرے ساتھ ہنس کر سوئی تھیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں رات بھر خوش
رہنے والی لڑکی صبح کیوں خودکشی کرے گی؟"
اس کی ان باتوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کہا "تمھاری
خالدہ باجی نے یہ ضرور بتایا ہوگا کہ وہ کیوں خوش ہیں؟"
اس کی نظریں مجھ سے ملیں پھر اس نے جلدی سے نظریں
جھکا لیں۔ اپنے پاؤں کے انگوٹھے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے
اس کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں انگوٹھے کبھی مڑ
رہے تھے کبھی سیدھے ہو رہے تھے۔ جیسے وہ پریشان ہو کر سوچ رہی
ہو کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہو۔ میں نے پوچھا "کیا تم یہ سوچ رہی
ہو کہ تمھیں اپنی خالدہ باجی کی آخری مسرتوں کے متعلق کچھ بتانا چاہیے
یا نہیں؟ اور اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ نہیں بتانا چاہیے تو بہت بڑی
غلطی کرو گی۔"
اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس
کی کٹورا جیسی آنکھیں بڑی ہی قاتلانہ تھیں۔ کہنے کی ضرورت ہی کیا
ہے ایسی آنکھیں قتل کرتی ہیں تبھی اتنے قتل ہوتے ہیں۔ اس نے بجھے
بجھے جتائیں۔ ادھر ادھر سر گھما کر معنی خیز انداز میں دیکھا پھر میری
طرف سر جھکا کر سرگوشی میں بولی "میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں
گی مگر میں آپ پر کس معاملے میں بھروسہ کر سکتی ہوں؟"
"تم آنکھیں بند کرکے بھروسہ کرو۔ میں صرف ایک فرض شناس افسر
ہی نہیں ہوں، ایک فرض شناس انسان بھی ہوں اور دوسروں کی عزت
کا خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔"
وہ پھر سرگوشی میں بولی "میرے ابا بہت غیرت مند ہیں۔ وہ
کبھی یہ برداشت نہیں کریں گے کہ خالدہ باجی کسی کو چاہتی تھیں۔ انھوں
نے بڑی مشکلوں سے ہمیں پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ جب ہم
بہنوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کرلی تو وہ ہمیں آگے پڑھنے کی
اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ کالج کا ماحول اچھا نہیں
ہوتا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔ جہاں مرد و عورت ساتھ
ہوں وہاں بے حیائی رک نہیں سکتی۔"
وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "ہم تینوں بہنیں مایوس ہو
گئی تھیں لیکن امی نے ضد کی۔ نانی بھی پیچھے پڑ گئیں۔ پھر ہم بہنوں نے
کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ابا ہمیں بہت چاہتے ہیں۔ آخر انھوں نے تھک
ہار کر کہا "میں جانتا ہوں تم لوگوں کو تعلیم ضرور دلانا چاہیے۔ اب
ہمارے لڑکے بھی زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے لگے ہیں اور
زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ بہر حال ہمیں
کالج میں پڑھنے کی اجازت مل گئی۔"
میں نے پوچھا "کیا تمھارے ہاں پردے کا رواج ہے؟"
"بے شک ہے۔ ہم تینوں بہنیں برقع پہن کر اسکول بھی جاتی تھیں
اور کالج بھی۔ ہم نے اپنے باپ کے اعتماد کو بحال رکھا۔ کتنے ہی لڑکے
ہمارے پیچھے پڑ جاتے تھے لیکن ہم نے کبھی کسی کو لفٹ نہیں دی۔"
"چلو مان لیتا ہوں کسی کو لفٹ نہیں دی۔ پھر وہ لڑکا کون ہے
جسے تمھاری خالدہ باجی چاہتی تھیں؟"
"وہ تیس برس کی ہو گئی تھیں۔ آخر انتظار کی حد ہوتی ہے۔ صبر
ڈگمگا جاتا ہے۔ ہمارے حالات، ہمارے آس پاس کا ماحول، ریڈیو اور
ٹی وی ہمیں بہکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔"
"کیا تم اپنی خالدہ باجی کے بہکانے والے فرشتے کا نام اور پتا بتا سکتی ہو؟"
"باجی نے کل رات ہی مجھے اپنا رازدار بنایا تھا۔ پتا نہیں یہ
سلسلہ کب سے چل رہا ہوگا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مجھے رازدار
بنائے بغیر وہ رات کو کمرے سے نکل کر نہیں جا سکیں گی تو انھوں نے
اتنا ہی کہا کہ وہ کسی کو چاہتی ہیں اور آج رات کے پچھلے پہر اس سے
ملنے جائیں گی۔"
"تمھاری بہن رات کے پچھلے پہر کسی سے ملنے گئی۔ اس سلسلے
میں تمھارے کیا خیالات ہیں؟"
اس نے نظریں جھکا لیں پھر کہا "آپ لوگوں کی نظروں میں یہ
بے حیائی ہوگی لیکن میں پوچھتی ہوں وہ اور کس عمر میں دلہن بن سکتی
تھیں اور اگر دلہن نہیں بن سکتی تھیں تو پھر اور کتنے برس بعد جاکر کسی
کو چاہتیں۔ کیا بڑھاپے میں؟"
"تمھارا لہجہ بڑا تلخ ہے۔"
"دیکھیے آفیسر! میں صرف اپنے باپ سے ڈرتی ہوں بلکہ
ڈرتی نہیں، اتنی زیادہ محبت کرتی ہوں کہ انھیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتی
میں نہیں چاہتی کہ انھیں میری باجی کے متعلق یہ سب کچھ معلوم ہو ورنہ
میں بھی تیس برس کی ہو چکی ہوں۔ میں بھی سوچتی ہوں میرا انجام کیا
ہونے والا ہے۔ کیا میری زندگی میں کوئی محبت کرنے والا نہیں
آئے گا اور اگر محبت کرنے والا نہیں آئے گا تو عاشق بن کر دھوکہ
دینے والا ہی آ جائے۔ میں نے کہا نا، میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں
بہت بے باک ہوں اور اسی بے باکی سے پوچھتی ہوں کیا میں بہت
خوبصورت نہیں ہوں؟"
میں ایک دم سے چونک کر صوفے پر سیدھا بیٹھ گیا۔ ایسے
سوال کی توقع ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شدید حیرانی سے دیکھنے لگا اور
وہ بڑی بے باکی سے میری نظروں میں نظریں ڈال کر طنزیہ انداز اختیار کیے
ہوئے تھی۔ پتا نہیں ہم کتنی دیر تک خاموش رہے۔ اس نے سرگوشی
میں پوچھا "آپ نے کوئی جواب نہیں دیا؟"
میں نے متحرک نظروں کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے پوچھا
"کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کتنے لوگ میرے دیوانے ہوں گے؟"

میں نے مجرمانہ انداز میں سر ہلایا۔ اس نے کہا "لیکن میں تو ان میں سے نہیں ہوں جو سوچ سمجھ کر کسی کا ہاتھ پکڑ لوں گی۔ میں خالدہ باجی کی طرح کسی عاشق کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتی۔"

"تمھاری باجی کو کسی عاشق نے قتل نہیں کیا ہے؟"

"جب مجھے باجی کے متعلق اطلاع ملی تو میں برقع پہن کر کالج کے اس حصے میں گئی تھی۔ وہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ محلے کی عورتیں بھی تھیں۔ میں نے آپ کو بھی وہاں دیکھا۔ اپنی باجی کو بھی دیکھا۔ جو چھت کے شہتیر سے لٹک رہی تھیں۔ کمرے میں کوئی سامان نہیں ہے۔ یہ میں پہلے سے جانتی ہوں۔ یہ بات میرے دماغ میں کھٹک رہی تھی کہ آخر باجی اتنے اوپر پھندے تک کیسے پہنچ گئیں یقیناً کسی نے پہنچایا ہوگا اور پہنچانے والا وہی شخص ہوگا جس سے باجی ملنے گئی تھیں۔"

"میرا ایک ساتھی افسر بھی یہی سوچ رہا ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے وہ چاہنے والا کیوں ایسا کرے گا؟ اور اگر اس نے ایسا کیا ہے تو میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن وہ کہاں مل سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو۔ اس کے متعلق نہیں جانتی ہو لیکن کیا اسے ڈھونڈ نکالنے میں مجھ سے تعاون کر سکتی ہو؟"

"ضرور کروں گی۔"

"کیا تمھاری باجی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس لڑکے کا تعلق کہاں کا ہے یا وہ تمھاری برادری سے تعلق رکھتا ہے؟"

"میں باجی سے پوچھتی رہتی تھی طرح طرح کے سوالات کیے لیکن وہ مجھ کو اس شخص کے متعلق معلوم ہو۔ لیکن وہ ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیتی تھیں کہ آج اسے ملاقات کرنے دو۔ اس نے وعدہ کیا ہے آج رات مجھ سے وہ مستقبل کے متعلق اہم فیصلہ کرے گا۔ میں نے باجی کو سمجھایا کہ آپ سے چھوٹی ہوں لیکن اتنی عقل رکھتی ہوں کہ جو شخص دن کی روشنی میں فیصلہ نہ کر سکے وہ رات کے اندھیرے میں صرف بری نیت سے آئے گا۔" ساجدہ نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر کہا "تب باجی نے مجھ سے کہا تم میری بہن ہو ورنہ اس منزل سے گزر چکی ہوں جہاں کسی کی بری نیت سے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے پوچھا "اگر میں اس کیس کے سلسلے میں پھر تم سے ملاقات کرنا چاہوں تو کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

اس نے بڑی بے بسی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "میں نے آپ کو اپنی باجی کا جواب سنا دیا۔ پھر سننا چاہتے ہیں تو سنیے ہم لڑکیاں اس منزل سے گزر چکی ہیں جہاں کسی کی بری نیت سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے کوئی ڈر نہیں ہے آپ جہاں کہیں گے وہاں ملوں گی۔"

میں نے ایک کاغذ پر اپنا فون نمبر لکھ کر اسے دیا پھر کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم کل مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرو۔"

میں وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے روز خالدہ کے متعلق پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ رپورٹ کے مطابق اس کے جسم پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے ظاہر ہو کہ اس سے زیادتی کی گئی ہے۔ کسی نے اس کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ ہم نے تو وہاں اسے دانستہ کمرے میں اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس کے جسم پر پورا لباس تھا اور اس لباس پر کسی قسم کی چھین جھپٹ کا نشان نہیں تھا۔

اسے زمین سے پھندے تک اٹھانے والے قاتل نے اسے بڑی عزت اور آبرو کے ساتھ اٹھا دیا تھا۔ اس کا مطلب نہیں تھا کہ عزت رکھ کر قتل کرنے والا قابل عزت ہو سکتا ہے جو خالدہ سے ملنے آیا تھا وہ ہوس پرست نہیں تھا لیکن پیشہ ور یا جنونی قاتل ہو سکتا تھا۔

میں نے شام کو رمضو قصائی کے محلے میں جا کر پان سگریٹ کی دکانوں میں اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک پان والے نے کہا "صاحب! جس گھر کی چار دیواری میں جوان لڑکیاں رہتی ہوں اور وہ باہر نکلتی ہوں تو پروانے آس پاس چکر لگاتے ہیں۔ لیکن جو لڑکیاں اسکول کالج جاتی ہوں۔ تو ان کے عاشقوں کا کچھ پتا نہیں چلتا کیونکہ ملاقاتیں گھر اور محلے سے دور ہوا کرتی ہیں۔ یہ یقین سے کہتا ہوں صاحب! میں نے رمضو بھائی کے مکان کے آس پاس کسی عاشق مزاج کو گھومتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

اس پان والے نے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ جو مال گھر میں چھپا کر رکھا جاتا ہے چور اسے چوری کرنے کے لیے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔ رمضو قصائی کی لڑکیاں گھر میں چھپ کر نہیں رہتی تھیں بلکہ جا بجا آتی جاتی تھیں پھر کالج جانے لگی تھیں۔ اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں کے پاس بھی آتی جاتی ہوں گی۔ ایسی صورت میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ خالدہ کسے چاہتی تھی اور پچھلی رات کس سے ملنے اس خالی کمرے میں گئی تھی۔

دوسرے دن صبح دس بجے خالدہ نے فون کیا "ہیلو آفیسر!" میں نے کہا "میں چاہتا ہوں تم مجھے آفیسر سمجھ کر گفتگو نہ کرو۔"

"اچھی بات ہے، مسٹر طارق جمال۔"

"مجھے جی بھی کہتے ہیں۔"

"یعنی اور زیادہ بے تکلفی؟"

"کیا تمھیں اعتراض ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ اس وقت دس بجے ہیں۔ ایک بجے کالج سے چھٹی ہوتی ہے لیکن میں ٹھیک آدھے گھنٹے بعد یعنی ساڑھے دس بجے کالج کے گیٹ پر انتظار کروں گی۔ اور میں جانتی ہوں تم ضرور آؤ گے۔"

اس نے اتنا کہا اور میرا جواب سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ میں نے حیرانی سے سوچا، اس لڑکی کو اپنے آپ پر کتنا اعتماد ہے۔ وہ جانتی ہے میں کشاں کشاں آؤں گا اسی لیے اس نے ریسیور رکھ دیا ہے۔

اس کا اعتماد غلط نہیں تھا۔ میں ٹھیک ساڑھے دس بجے کالج کے گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ انتظار کر رہی تھی۔ میں نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ آکر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازے کو بند کیا گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا "کہاں چلوگی؟"

اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر کہا "اسٹیرنگ تمھارے ہاتھ میں ہے اور مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ میں ایک بجے تک آزاد ہوں۔ اگر تم سوا ایک بجے تک نیا چوراہے پہنچا دو تو میں وہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر چلی جاؤں گی۔"

"اور اگر ایک بجے سے پہلے تمھارے باپ نے مجھے تمھارے ساتھ دیکھ لیا تو؟"

"ایک قصائی کی بیٹی کو اپنی کار میں بٹھانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے تھا وہ ہڈیاں توڑتا ہے اور قیمہ بہت باریک کرتا ہے۔"

"تم جتنی حسین ہو اتنی ٹیڑھی بھی ہو۔ کیا کسی بات کا سیدھا جواب نہیں دے سکتیں؟"

"اب ہمارے معاشرے میں کوئی بات سیدھی نہیں رہی۔ کیا یہ بات ٹیڑھی نہیں ہے کہ ہمارے لوگوں کی زیادتیوں نے مجھے اپنے باپ کو دھوکا دینا سکھا دیا ہے اور تم تفتیش کے بہانے ایک باپ کی غیرت کو ساتھ لیے پھر رہے ہو۔"

مجھے چپ سی لگ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد پوچھا "اس معاشرے میں جن لوگوں نے زیادتی کی ہے، ان میں سے خاص طور پر کسی کی نشاندہی کر سکتی ہو؟"

"خاص طور پر ہماری برادری والے ہیں۔ ہمارے ہاں پنچوں نے فیصلہ کیا تھا کہ میرے ابا اگر بلقیس بانو سے شادی کر لیں گے تو بلقیس بانو کے بھتیجے سے ہماری آپا ماجدہ کی شادی کر دی جائے گی۔"

میں نے کہا "تمھارے ابا یہ بیان دے چکے ہیں۔"

"میرے ابا کہہ رہے تھے کہ دونوں شادیاں آگے پیچھے ہوں گی۔ یعنی پہلے میری بہن ماجدہ کی شادی بلقیس بانو کے بھتیجے ظفر سے ہوگی۔ اس کے دوسرے دن میرے ابا بلقیس بانو سے نکاح پڑھا لیں گے۔ لیکن ظفر بی اے کے امتحانات کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد شادی کرنا چاہتا تھا لہٰذا پنچوں نے میرے ابا کو پہلے شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے شادی کر لی۔ اس کے ایک ماہ بعد پتا چلا ظفر لندن جا رہا ہے۔ لندن میں ہماری برادری سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ ہیں۔ وہاں سے ایک خاندان یہاں آیا تھا وہ بڑے پیسے والے، بڑے اثر و رسوخ والے تھے۔ ہماری برادری کے لوگوں پر رعب و دبدبہ چھائے ہوئے تھے پنچایت پر بھی ان کا اثر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے پنچ کے پانچ آدمیوں میں سے تین آدمی وعدے سے پھر گئے۔ انھوں نے کہا ظفر لندن جا کر ایک کامیاب اور خوشحال زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ ماجدہ کو یہاں بہت سے لڑکے مل جائیں گے لیکن ظفر کو ترقی کرنے کا اتنا اچھا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا لندن والی فیملی میں شادی کر کے وہاں سیٹ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ میں سن چکا ہوں۔ آگے کیا ہوا؟"

"اور کیا ہونا تھا۔ پنچوں کا یہ فیصلہ سن کر میرے ابا جنون میں مبتلا ہو گئے۔ ایک دم سے اٹھ کر بھری پنچایت میں گالیاں دینے لگے۔ برادری والوں اور پنچوں کو آڑے ہاتھوں لینے لگے۔ ہماری برادری میں بڑے مالدار لوگ ہیں بھلا وہ میرے باپ کی بات کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ سنایا کہ جب تک میرے ابا بھری پنچایت میں ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی نہیں مانگیں گے اس وقت تک برادری والے ہم تینوں بہنوں کا رشتہ مانگنے میرے ابا کے دروازے پر نہیں آئیں گے اور اگر ابا نے ہم میں سے کسی بہن کی شادی برادری سے باہر کی تو انھیں ہمیشہ کے لیے برادری سے الگ کر دیا جائے گا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں کار ڈرائیو کرتا ہوا ایک اسنیک بار کے سامنے آکر رک گیا۔ چائے کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آئی تو ہم کار میں بیٹھ کر پینے لگے۔ میں نے پوچھا "کیا تم اس روز گھر میں تھیں جب تمھاری بڑی بہن ماجدہ آگ میں جل گئی تھی؟"

"ہاں میں گھر میں تھی۔ اس روز کالج جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ابا پچھلے دن پنچایت والوں سے جھگڑا کر چکے تھے۔ ان کا غصہ ہم پر اتار رہے تھے۔ بات بات پر جھگڑا کر رہے تھے۔ ماجدہ آپا کو گالیاں دے رہے تھے کہ وہ مر کیوں نہیں جاتیں۔ اگر وہ پیدا نہ ہوتی تو آج بھری پنچایت میں ذلیل نہ ہونا پڑتا اور ایک لڑکا ان کے منہ پر تھوک کر لندن والوں کا داماد نہ بنتا۔"

ساجدہ نے چائے کی پیالی کو اپنے گلابی ہونٹوں سے لگایا۔ دو چار گھونٹ پی کر پھر کہا "اس روز ابا ہماری سوتیلی ماں کے پاس نہیں گئے۔ ہمارے ہی گھر میں رہے مگر صبح سے رات ہو گئی انھوں نے ایک نوالہ بھی منہ میں نہیں رکھا ایک گھونٹ بھی پانی نہیں پیا۔ ہم نے انھیں کھانے کے لیے کہا تو جھڑکیاں سننی پڑیں۔ صبح ان کا غصہ کسی حد تک کم ہو گیا۔ انھوں نے ماجدہ آپا سے چائے بنانے کے لیے کہا۔ میں اور خالدہ اپنے کمرے میں تھیں۔ وہاں سے آپا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں یہ باورچی خانے میں کیسی عجیب سی پیٹرول جیسی بو آ رہی ہے۔"

ساجدہ چائے پیتے پیتے رک گئی۔ اس نے پیالی ڈیش بورڈ پر رکھ دی۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا، تم چائے کیوں نہیں پی رہی ہو؟"

"بس جی نہیں چاہتا۔ آپا کی وہ آخری آواز میرے دل میں تیر کی طرح لگی ہے۔ اس کے بعد ہم نے پھر کوئی بات نہیں سنی صرف ان کی چیخیں سنائی دیں۔ ہم سب گھبرا کر کچن کی طرف بھاگے۔ ہمارے

ہے۔ یہ چند قدم کا فاصلہ
سب لوگوں کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک شعلوں میں لپٹ چکی تھیں۔ وہ ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیسی آگ تھی جو بجھ نہیں رہی تھی۔ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ابا دوڑتے ہوئے غسل خانے میں گئے اور پانی سے بھری ہوئی بالٹی لا کر آپا کے اوپر پھینکا۔ آگ کچھ دبی، پھر ابھر گئی۔ میں اور خالدہ باجی دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئیں، کمبل اٹھا لائیں۔ پھر اس کمبل کو باجی کے اوپر ڈال دیا تب کہیں وہ آگ بجھی۔ لیکن وہ اس قدر جل چکی تھیں کہ بیہوش ہو گئی تھیں۔ وہ میری آپا! اسپتال تک پہنچتے پہنچتے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور غور کر کے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایکدم سے چونک کر پوچھا: "تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

میں چونک گیا۔ پھر معذرت چاہتے ہوئے کہا: "سوری! بعض اوقات کسی اہم نکتے تک پہنچتے وقت اسی طرح ایک طرف گھورنے لگتا ہوں۔"

"کوئی اہم نکتہ ہاتھ آیا ہے؟"

"ہاں، تم ابھی اپنی ماجدہ آپا کے آخری الفاظ بیان کر رہی تھیں۔ ذرا انھیں پھر ایک بار دہراؤ۔"

"مجھے ہو بہو وہ الفاظ یاد نہیں ہیں۔ انھوں نے کچھ یہی کہا تھا کہ باورچی خانے میں نہ جانے کیسی پٹرول جیسی بو آ رہی ہے۔"

"بس یہی ایک اہم نکتہ ہے۔ وہاں پٹرول جیسی بو کیوں آ رہی تھی۔ وہاں پٹرول کیسے پہنچ گیا تھا۔ کیا تمھارے گھر میں پٹرول کا کوئی کام ہوتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ ہمیں کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مسٹر جی! تمھارا یہ اہم نکتہ مجھے بھی اہم لگ رہا ہے۔ آپا کے ساتھ ایسی ٹریجڈی ہوئی کہ ہم وہ پٹرول والی بات بھول ہی گئی تھیں۔"

"جب تمھارے ابا چچا سے جھگڑا کر کے آئے تو کیا اس کے بعد برادری کا کوئی آدمی تمھارے گھر آیا تھا؟"

"ایک نہیں کتنے ہی ایسے آئے تھے جو ابا سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جو دوغلے تھے۔ ادھر ابا سے ہمدردی رکھتے تھے اور ادھر جا کر چچا کو مشورے اور مزاج کرتے تھے۔"

"کیا ان میں ایسے بھی ہیں جو تمھارے گھر کے اندر آتے ہوں یعنی کچن تک پہنچ جاتے ہوں؟"

"ہاں، ابا کی دکان میں کام کرنے والے سری پائے والا بچا گوشت لے کر کچن میں آتے ہی رہتے ہیں۔"

"کیا تمھارے ابا نے ظفر کے خلاف کوئی چیلنج کیا تھا؟"

"ہاں، وہ ابا پر تنقید کر سکتے تھے کہ ظفر کی شادی نہیں ہونے دیں گے اور ہمیں ... کہ برادری کا فیصلہ کس طرح ٹالتے ہیں۔ جو فیصلہ ایک بار ہو چکا ہے اس پر عمل کرنا ہی ہو گا۔ ظفر کو ماجدہ سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔"

"تمھارے باپ کا یہ چیلنج صرف ظفر کے لیے نہیں بلکہ پوری برادری کے لیے لڑکوں کے لیے تھا۔ انھوں نے یہ دیکھا ہو گا کہ چچا کے دو تین لڑکے تمھارے باپ کے حمایتی ہیں۔ اگر تمھارے باپ نے اور حمایتی پیدا کر لیے تو ظفر کو ماجدہ سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ شاید اسی لیے ان میں سے کسی نے سازش کی اور ماجدہ کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا۔"

ماجدہ کی کٹورا جیسی آنکھیں بہت ہی خوبصورت تھیں مگر غصے میں غضبناک ہو جاتی تھیں۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔ پھر اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ لانبے لانبے ناخن میری کلائی کے گوشت میں کھب گئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی: "کس نے آگ میں جھونکا ہے؟ تم جاسوس ہو، تم معلوم کر سکتے ہو۔"

"یہ کیا کر رہی ہو؟ میری کلائی زخمی ہو رہی ہے۔"

اس نے چونک کر میرے ہاتھ کو دیکھا۔ اپنی گرفت ڈھیلی کر لی۔ میری کلائی کے ایک آدھ حصے سے خون کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ پہلے کیا عورتوں کے سینڈل کافی نہیں تھے کہ اب وہ ناخنوں کو اسلحہ بنائے گھومتی ہیں۔

یہ سراسر میری توقع کے خلاف تھا۔ ابھرتی ہوئی لہو کی ننھی ننھی

غزل

نادرؔ صدیقی
بلاری۔ کرناٹک

جہاں جہاں پر بکھرے ہیں نالے جہاں جہاں بھی آہ کی ہے
وہاں خزاں ہی خزاں رہے گی وہاں نہ پیدا بہار ہو گی

میری محبت کو پاش کرنے مٹانے والے قسم ہے تیری
کہیں تو اس کا وجود ہو گا کہیں تو وہ بے قرار ہو گی

تو میری پروا نہ کر ذرا بھی مٹانے والے مٹا دے مجھ کو
مجھے تو ہے بس خیال اس کا کہ تیری جاں بے قرار ہو گی

میں ایسی کشتی کا ناخدا ہوں نہ جس کی منزل نہ جس کا مقصد
نہ ختم جس کا سفر ہی ہو گا، کبھی نہ جو ہم کنار ہو گی

یہ خون ناحق جو ہو رہا ہے اسی سے اک دن وہ گل کھلیں گے
جسے کہ نادرؔ خزاں نہ ہو گی وہ ایسی پیدا بہار ہو گی

بوندیں اپنی جگہ تھم گئیں لیکن رگوں میں دوڑتا ہوا لہو کچھ اور تیز ہو گیا۔ دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں۔ ہم چند لمحوں تک ایسی ہی حالت میں گم سم رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے جواباً کیا کرنا چاہیے۔ اگر کچھ بھی کہتا تب بھی کچھ ذکر پاتا۔

اس نے کہا: "میں تمھیں تمھارے لہو کی قسم دیتی ہوں، تم جو بھی کہو گے وہ میں کروں گی مگر خدا کے لیے میرے دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کر دو۔ میں تمھاری باتوں سے اچھی طرح سمجھ گئی ہوں، میری دونوں بہنیں ایسی ہی کسی سازش کے تحت ماری گئی ہیں۔"

میں نے پوچھا: "میں جو کہوں گا وہ کرو گی؟"

"ضرور کروں گی۔" اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"انکار تو نہیں کرو گی؟"

"آزما کر دیکھ لو۔"

"اچھی بات ہے۔ اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے میرا منہ نوچ ڈالو۔"

وہ شدید حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی: "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں تم سے مدد مانگ رہی ہوں اور تمھارا ہی منہ نوچوں گی؟"

"ابھی تو تم نے کہا تھا میری کسی بات سے انکار نہیں کرو گی۔"

"میں انکار نہیں کر رہی ہوں۔ لیکن معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تمھارے اس مطالبے میں کتنی معقولیت ہے۔"

"زبان دینے کے بعد معقولیت اور نامعقولیت کا حساب نہیں کیا جاتا۔"

"آخر تم ایسا کیوں چاہتے ہو، تمھارا منہ نوچوں گی تو تمھیں کیا مل جائے گا؟"

"اس سے تمھیں غرض نہیں ہونا چاہیے کہ مجھے کیا ملے گا۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمھاری مدد کروں تو میرے احکامات پر بے چون و چرا عمل کرنا پڑے گا۔"

اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میں نے چائے والے کو پیالیاں واپس کیں، پیسے ادا کیے۔ پھر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم بڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر میں نے کہا: "تم ان لڑکیوں میں سے ہو جو جوش میں آ کر وعدہ کر لیتی ہیں مگر پورا نہیں کر سکتیں۔"

"میں جو وعدہ کرتی ہوں اسے ہر حال میں پورا کرتی ہوں لیکن تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کیا میں پاگل ہوں کہ تمھارا منہ نوچنے بیٹھ جاؤں۔"

میں نے کہا: "میں تم سے دو باتوں پر عمل کرانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کیا تم کرو گی خواہ وہ باتیں کتنی ہی غلط کیوں نہ ہوں۔"

"میں اپنی بہنوں کے قاتل تک پہنچنے کے لیے تمھاری کسی بات کو غلط نہیں سمجھوں گی۔"

"میری پہلی بات یا پہلا مشورہ یہ ہے کہ برادری کا جو بھی شخص تمھاری ذات میں دلچسپی لے اور تم سے عشق کرنا چاہے تم اس کی محبت کا جواب محبت سے دو۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے جواب دیا: "میری برادری میں ایسے چار جوان ہیں جو مجھ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کو دل دیا ہے، باقی تینوں کو میں بہلاوے دے رہی ہوں۔"

"یعنی ایک نہیں تمھیں چار عاشق ہیں جنھیں تم نے چھوٹ دے رکھی ہے۔"

"ہاں کبھی کبھی سوچتی ہوں، ابا جہیز نہیں دے سکتے۔ برادری والے دشمن بن گئے ہیں۔ کہیں سے میرا کوئی رشتہ نہیں آئے گا۔ چاہے ڈاکٹر، انجینئر کوئی تو ایسا آئے جو مجھے کسی طرح بھی لے جائے۔"

"ہاں جذبات کی آندھی میں ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔"

"میں کچھ اور سوچ کر ایسا چاہتی ہوں۔ اگر برادری کے ان تین جوانوں میں سے کوئی مجھے بھگا کر لے جائے گا تو برادری والوں کی بھی ناک کٹے گی۔ ان کا فیصلہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ کوئی یہ الزام نہیں دے گا کہ لڑکی نے لڑکے کو بھگایا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا۔ لڑکے لڑکی کو بھگاتے ہیں۔ ایسی صورت میں انھیں ہماری شادی کا فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم کسی کے ساتھ جاؤ گی تو تمھارے باپ کو بہت صدمہ پہنچے گا۔"

"ابھی کیا کم صدمہ پہنچ رہا ہے۔ اگر میں تھوڑا اور صدمہ پہنچا کر برادری والوں سے انتقام لے سکتی ہوں تو مجھے ایسا کرنا چاہیے۔" پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی: "ابھی تک میں نے ایسا نہیں کیا ہے اسی لیے تم سے کہتی ہوں، کسی طرح اس قاتل کو ڈھونڈ نکالو اور اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دو۔ مجھ پر اور میرے ابا پر تمھارا بڑا احسان ہو گا اور ہمارا انتقام پورا ہو جائے گا۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ وہ ایک گھنٹے بعد میری کار سے اتر جانے والی تھی۔ میں نے کہا: "تم میرے ساتھ آزادی سے گھوم نہیں سکتیں۔ اگر میں کہوں کسی پارک میں چلو، ذرا سی چہل قدمی کریں گے۔ تو یہ برقع جو ابھی گردن تک ہے وہ سر تک آ جائے گا۔ تم منہ پر نقاب ڈال لو گی۔ ایسے میں تمھارے ساتھ گھومتے ہوئے کیا خاک لطف آئے گا۔"

"میں مجبور ہوں۔ ابا میرے کالج جانے اور واپس آنے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ میری دوسری بہن کے ساتھ بھی اتنی بڑی ٹریجڈی ہوئی۔ وہ مجھے کالج جانے سے منع کر رہے تھے۔ میں نے بہانہ کیا، کتنی ہی باتیں بنائیں تب یہاں آئی ہوں۔ اب ایک بجے چلی جاؤں گی۔ یہ بھی میری مجبوری ہے کہ میں برقع اتار کر تمھارے ساتھ کسی پارک میں چہل قدمی نہیں کر سکتی۔ آخر برقع پہننے میں حرج کیا ہے؟"

دوسروں کو کیسے معلوم ہو گا کہ میرے ساتھ کتنی حسین دوشیزہ ہے۔ جب وہ کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے کی آدھی مسرت حاصل ہو گی، آدھی حسرت رہ جائے گی۔"

"تم موضوع سے بھٹک رہے ہو" وہ چپ رہی پھر بولی۔ "یہی فرق ہے کہ مجھے تمہاری دو باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ ایک بات ہو گئی، اب دوسری بات بتاؤ؟"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا پھر کہا "تمہیں تنہائی میں میرے ساتھ وقت گزارنا پڑے گا۔"

اس نے پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا تاکہ وہ بڑھتی ہوئی پھیلتی ہوئی لالی کے ساتھ ادھر سے بڑھتے ہوئے کھینچنے لگی۔ اپنے آپ کو اور زیادہ چھپانے لگی۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر کہا "ایسے وقت یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بات ناگوار گزری ہے یا گوارا ہے۔ ویسے ان حالات میں لڑکیاں گونگی ہو جاتی ہیں۔ خاموشی کو زبان بنا لیتی ہیں۔"

وہ بدستور خاموش رہی جیسے اس خاموشی کو اقرار بنا لیا ہو۔ میں نے کہا "چلو کوئی دوسری بات کرو۔"

وہ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آہستگی سے بولی "مجھے یقین ہے قاتل ضرور گرفتار ہو گا۔"

"میں یہی کام کرتا ہوں۔ سرکار کی طرف سے .... مجھے اس کام کے پیسے ملتے ہیں۔ کوئی کارنامہ انجام دینے پر انعام بھی ملتا ہے۔ پولیس غیر سرکاری طور پر انعام کی خواہش ہے۔"

میری باتوں سے یہی تاثر ملتا ہے کہ میں عیاش ہوں لیکن خدا گواہ ہے آج تک میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی اور نہ ہی میں ساجدہ کو اپنی تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اگر وہ آنا بھی چاہتی تب بھی میں کسی کی مجبوری سے کھیلنا گوارا نہیں کرتا۔

اس وقت میں ساجدہ سے جو کچھ بھی کر رہا تھا وہ میری تفتیش کا حصہ تھا۔ گو کہ بڑے افسران کسی بھی کیس کو بڑی سنجیدگی سے ہینڈل کرتے ہیں۔ میرا معاملہ اور ہے۔ جتنی پیچیدہ واردات ہوتی ہے میں اتنا ہی غیر سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ میرا تجربہ زیادہ نہیں ہے لیکن جتنا ہے صرف اتنا ہی تجربہ مجھے زندہ دل رکھتا ہے۔

ساجدہ نے کہا "ایک بجنے میں چند منٹ ہو گئے ہیں۔ مجھے نیا پور کی بس اسٹاپ پر چھوڑ دو۔"

میں نے گاڑی ادھر موڑ دی۔ وہ کہنے لگی "میں ان عاشقوں کو دور سے دکھا دوں گی جو میری برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان تینوں میں سے کوئی ایسا دشمن ہو جو ہماری ناواقفی میں واردات کر رہا ہو اور اب مجھے اپنا شکار بنانا چاہتا ہو۔ تم انہیں دیکھو گے مجھ کو تو شاید کسی پر شبہ ہو گا۔"

"میری بات چھوڑو، میں تو سب پر شبہ کرتا ہوں۔ تم پر بھی کرتا ہوں۔"

اس نے بڑی بڑی قاتل نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر پوچھا "کیا مجھ پر بھی کرتے ہو؟"

"ہاں، مجھے بھی ماجدہ اور خالدہ کی موت سے فائدہ پہنچا ہو میں ان سب پر شبہ کروں گا۔"

وہ شدید حیرانی سے بولی "بھلا میری بہنوں کے مرنے سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"دیکھو، اندازاً سب سے زیادہ تمہیں فائدہ پہنچے گا۔"

"لیکن کیسے؟"

"دیکھو، تمہارے ابا ایک بیٹی کو ایک لاکھ کا جہیز نہیں دے سکتے۔ بہت زیادہ کوشش کریں گے تو پچاس ہزار کا جہیز دے سکیں گے جبکہ رشتہ مانگنے والے ایک لاکھ سے کم پر آمادہ نہیں ہیں۔"

ساجدہ نے کہا "وہ تو ایک لاکھ سے بھی زیادہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

"میں اندازاً ایسا کہہ رہا ہوں۔ تم فرض کرو کہ ایک بیٹی کے لیے ایک لاکھ خرچ ہوں گے تو تین بیٹیوں کے لیے تین لاکھ۔ اب اگر پچاس ہزار کے حساب سے دیکھا جائے تو تین بیٹیوں کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے۔ اگر تین بیٹیاں نہ رہیں صرف ایک بیٹی ہے تو باپ کو دیکھو پچاس ہزار کا حساب پڑتا ہے۔"

اس کی خوبصورت آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ اس نے گھورتے ہوئے پوچھا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں نے اپنی دونوں بہنوں کو ہلاک کیا ہے یا کرایا ہے تاکہ مجھے ڈیڑھ لاکھ کا جہیز مل جائے۔ اور ابا پر بوجھ بھی نہ ہو؟"

میں نے کہا "ایسا ہماری دنیا میں ہوتا ہے۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔"

"کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ کیا میں اکیلی لڑکی پہلے اپنی بڑی بہن کو آگ میں جلاؤں گی پھر دوسری بہن کو پھانسی پر چڑھاؤں گی۔ کیا یہ عقل سوچ سکتی ہے؟"

"عقل تو بہت کچھ سوچ لیتی ہے اور ایسا عمل کرتی ہے کہ دوسرے بیکار ہو جاتے ہیں۔ تم نے ابھی کہا ہے کہ تمہارے تین عاشق ہیں۔ بہت ممکن ہے ان میں سے کوئی عاشق ان وارداتوں میں تمہاری پوری طرح مدد کر رہا ہو۔"

وہ چیخ کر بولی "یو شٹ اپ۔ گاڑی روکو۔ میں کہتی ہوں گاڑی روکو۔"

"لیکن ابھی نیا پور چونگی دور ہے۔"

"میں پیدل چلی جاؤں گی مگر تمہارے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کروں گی۔ میں بھول گئی تھی کہ تم جاسوس ہو، شکی مزاج ہو۔ تمہاری ایسی کی تیسی۔ میں دیکھتی ہوں کہ تم مجھے کس طرح قانون کی گرفت میں لو گے۔ ہاں، میرا ایک عاشق ہے، وہ میری مدد کر رہا ہے۔ بگاڑ لو میرا کیا بگاڑ لو گے۔ گاڑی روکتے ہو یا میں چیخنا شروع کر دوں؟"

میں نے گاڑی روک دی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا پھر ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ وہاں سے تیز رفتاری سے فٹ پاتھ پر جانے لگی۔ جب تھوڑی دور چلی گئی تو میں نے گاڑی آگے بڑھائی۔ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتا ہوا اس کے قریب آیا۔ پھر کھڑکی سے سر نکال کر کہا "اصل مجرم تک پہنچنے کے لیے ہر ایک پر شبہ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک قاتل پکڑا نہیں جائے گا میں تم پر شبہ کرتا رہوں گا اور تمہارے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا اور جب تک تمہارے خلاف ثبوت نہیں ملے گا میں تم سے تنہائی میں ملنے کی تمنا کرتا رہوں گا۔ تمہاری ڈائری میں لکھا ہے میرا فون نمبر لکھا ہو گا۔ ویش آل۔"

یہ کہہ کر میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ اسے فٹ پاتھ پر تنہا چھوڑ کر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ اسی لیے میں شادی نہیں کرتا۔ محبوبہ روٹھ جائے تو کوئی بات نہیں، وہ آتی جاتی چیز ہے لیکن روٹھ کر جائے تو ایک چیلنج بن جاتی ہے کہ میں صرف تمہاری بیوی نہیں ہوں، تمہارے بچوں کی ماں بھی ہوں۔ دیکھتی ہوں کس طرح منا نہیں لاؤ گے۔

ویسے شادی نہ کرنے کے باوجود ایک حقیقت اچھی طرح جانتا ہوں اور وہ یہ کہ شادی سے پہلے عورت محبوبہ بن کر مرد کا پیچھا کرتی ہے اور شادی کے بعد بیوی بن کر مرد کو پیچھے دوڑاتی ہے۔ مجھے یقین تھا وہ میرے پیچھے آئے گی۔ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کیا جاتا۔ اس کے گھر میں قتل کی ایک نہیں دو وارداتیں ہو چکی تھیں۔ قانون کے دریا میں سراغرساں ایک مگرمچھ کی طرح ہوتا ہے اور وہ اتنی نادان نہیں تھی کہ مجھ سے دشمنی مول لیتی۔

اس نے دو دن تک رابطہ قائم نہیں کیا۔ تیسرے دن فون پر اس کی آواز سنائی دی "میں کالج میں ہوں اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد گیٹ کے سامنے ملوں گی۔"

میں گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ پہلی ملاقات میں بھی یہی ہوا تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ پھر اس نے پوچھا "کیا ناراض ہو؟"

"اگر ناراض ہوتا تو نہ آتا۔ تم ناراض تھیں اس لیے دو دن بعد آئی ہو۔"

"میں مجبور تھی۔ ابا میرے کالج آنے پر اعتراض کرتے تھے۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ نانی میرے لیے جھگڑا کرنے لگیں تب وہ مجبور ہو گئے۔ اسی لیے آج آئی ہوں۔"

"تمہارے ابا زخم خوردہ ہیں۔ ان کا اعتراض درست ہے۔ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ تمہیں اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ تمہیں گھر کی چار دیواری میں محفوظ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے دماغ میں پھر یہی بات آئی کہ تمہیں گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تو وہ پھر اعتراض کریں گے۔"

وہ بولی "میرا خیال ہے اب وہ ایسا نہیں کریں گے۔"

"عاشقوں نے ہمیں ایک ساتھ دیکھ لیا تب کیا ہو گا؟"

"اسی بات سے ڈرتی ہوں۔ پھر تو ہمیشہ کے لیے گھر کی چار دیواری میں قید ہو جاؤں گی۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تنہائی میں ملو۔"

"لیکن کہاں؟ میں گھر سے کیسے نکل سکتی ہوں؟"

"تم نے وعدہ کیا تھا، اگر تمہارا کوئی عاشق تم سے ملنا چاہے تو تم اسے ڈیٹ پر رو گی تاکہ میں اس کا محاسبہ کر سکوں۔ اگر قاتل تک پہنچنے کے لیے میں تم سے یہ کہتا کہ تم اس شخص کو اپنی تنہائی میں بلاؤ تو کیا کرتیں؟"

"میں نے اس پہلو پر غور کیا ہے۔ میں نے سوچا تھا جب ایسی کوئی بات ہو گی تو ایک طرف تمہیں اطلاع دوں گی دوسری طرف ابا کو اس بات کی خبر ہو گی کہ میں ایک دشمن کو دوست بنا کر اسی کمرے میں بلا رہی ہوں جو کسی کرائے دار کے انتظار میں خالی پڑا ہے۔"

میں زیر لب مسکرانے لگا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ پھر پوچھا "کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"تم میرے لیے بھی سوچو کیا آج رات ہم اس خالی کمرے میں ملاقات نہیں کر سکتے؟"

اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ شرما رہی ہے یا کسی چور کی طرح منہ چھپا رہی ہے۔ میں نے کہا "جو مجھے دیوار گھر اپنے کسی ایک چاہنے والے کو بلاؤ اور آج رات ہی بلاؤ۔ میں یہ قصہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا قصہ؟"

"یہی کہ تمہاری بہنوں کی موت کس طرح ہوئی؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا "کیا آج رات یہ معلوم ہو جائے گا کہ ماجدہ آپا اور خالدہ باجی کا قتل کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟"

"میرا خیال ہے معلوم ہو جانا چاہیے۔"

"لیکن کیسے؟ میں تمہیں بلاؤں تو کیا تمہارے پیچھے قاتل بھی آئے گا؟"

"تم مجھے بلاؤ یا اپنے کسی اور چاہنے والے کو۔ اگر وہ چاہنے والا ہی دشمن ہوا تو بے نقاب ہو جائے گا۔ اگر وہ نہ ہوا تو اس کے پیچھے وہ رقیب ضرور آئے گا جو تم بہنوں کو نہ کسی کی بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے نہ کسی کی محبوبہ کے روپ میں۔"

وہ میری باتوں سے الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس نے پوچھا "کیا یہ ضروری ہے کہ آج ہی رات تم مجھ سے ملنے آؤ تو کوئی رقیب بھی تمہارے تعاقب میں چلا آئے؟"

"اگر کوئی رقیب نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ قاتل تمہارے گھر میں ہے اور وہ تم ہو۔"

"تم نے پھر بکواس شروع کی۔"

"تم خود سوچو، میری باتوں پر غور کرو، شبہ کس پر جاتا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "میں دو روز پہلے تمہاری

باتوں سے خشک ہو گئی تھی۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ جلد ہی میں ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو واقعی ساری بات میرے خلاف جاتی ہے۔ بے شک ماجدہ آپا اور خالدہ باجی کی موت سے مجھے فائدہ پہنچ سکتا ہے مگر خدا گواہ ہے میں یہ فائدے اٹھاؤں۔"

دوسرے کریں۔ کیا تم کسی کا دل ... ہو گا۔ خود کو شبہات سے بالاتر

"تمھاری باتوں سے مجھے خوشی ہو گی۔ خود کو شبہات سے بالاتر رکھنے کے لیے ... اگر آج رات وہ رقیب ہمارے تعاقب میں ہو جائے۔"

"ابھی رات ہے، میں آ جاؤں گی۔"

"میں رات کے دو بجے وہاں رہوں گا۔ تمھیں جب بھی موقع ملے چلی آنا۔ میں صبح تک انتظار کروں گا۔"

ایسا کہتے وقت میرے اندر حرارت سی بھر گئی۔ ایک حسین اور جوان لڑکی مجھ سے ملے گی۔ رات کو ایک خالی کمرے میں ملے گی۔ یہ تصور ہی گدگدانے اور گرمانے لگتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں جو پارسا بنتا ہوں اور قتل کے کیس میں دلچسپی رکھتا ہوں اور اسی کیس کے حوالے سے ماجدہ سے ملنے جاؤں گا تو کیا میری شرافت اور پارسائی برقرار رہے گی؟

ہم نیا چوراہا آئے یہاں سے وہ بس میں بیٹھ کر جانے والی تھی۔ اس نے گاڑی سے اترنے سے پہلے کہا: "کبھی کبھی ابا ہمارے ہاں آتے ہیں اور رات وہیں گزارتے ہیں۔ اگر وہ آج آ گئے تو میں نہیں آ سکوں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کل رات آؤں گا۔ کل بھی نہیں آ سکو تو پرسوں رات آؤں گا۔ اسی طرح آتا رہوں گا۔ کسی رات تو تمھیں وہاں آنے کا موقع ملے گا۔"

وہ سر جھکا کر ذرا شرمائی، ذرا مسکرائی پھر دروازہ کھول کر چلی گئی۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایک حسین لڑکی کی نزاکت سے تراشا ہوا بدن تراشیدہ لگتا ہے۔ کسی کو دو راتیں قتل کرنے کے خیال سے بے پرواہ ... کیسے لگ گئی؟

میں یہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ وہ جا چکی تھی اور میں خیالوں میں بہک رہا تھا۔ کہیں اپنے فرض سے بھٹک رہا ہوں۔ کیا میں حسن و عشق کے چکر میں الجھ رہا ہوں۔ میں تو اس حسینہ کے ذریعے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں وہ مجھے کہاں پہنچانے والی تھی۔

میں نے دفتر میں قدم رکھا۔ میرا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ جمشید ہزاروی نے مجھے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں کہا: "لو آ گئے، لیلیٰ کے دیوانے۔"

میرے ایک ساتھی سراغ رساں نے پوچھا: "جی! یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ کیا تم واقعی خالدہ کا کیس چھوڑ کر ماجدہ کے کیس میں دلچسپی لے رہے ہو؟"

میں نے جمشید ہزاروی کی طرف دیکھا۔ پھر کہا: "بھائیو! میں کوئی اناڑی جاسوس تو نہیں ہوں۔ یہ میں نہیں کہتا، لڑکیاں کہتی ہیں کہ میں بہت گڈ جوان ہوں۔ دراصل ہم جوانی میں کسی کو شکار کریں تو کوئی ہمیں شکار کرتا ہے۔ میرے ساتھ اکثر یہی ہوتا ہے۔ میں لڑکیوں سے بھاگتا ہوں اور لڑکیاں میرے پیچھے بھاگی چلی آتی ہیں۔ اب میں کہاں تک پیچھا چھڑا سکتا ہوں۔ بائی دی وے، تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ آج کل میں ماجدہ میں دلچسپی لے رہا ہوں؟"

سب نے جمشید ہزاروی کی طرف دیکھا۔ ایک نے کہا: "جمشید صاحب نے دو بار تمھارا پیچھا کیا ہے۔ اور دونوں بار تمھیں اس کے ساتھ دیکھا ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "اچھا تو جمشید صاحب بھی خالدہ کا کیس بھول گئے ہیں۔ ماجدہ میں الجھنا چاہتے ہیں لیکن وہ میرے لیے رفیدہ ہو چکی ہے۔"

وہ ناگواری سے بولا: "میں تم جوانوں جیسا چھچھورا نہیں ہوں۔ میں پرائی بہو بیٹیوں کو اپنی بہو بیٹیاں سمجھتا ہوں۔"

میں نے کہا: "آپ کی عمر کا تقاضا بھی یہی ہے۔"

وہ غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اتنے میں ایک چپراسی نے آ کر مجھ سے کہا: "جناب! آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں کوریڈور کی طرف جانے لگا۔ جمشید ہزاروی نے طنزیہ انداز میں کہا: "بڑے صاحب بھی میری طرح بوڑھے ہیں۔ مرد کے بچے ہو تو انھیں بھی یہی جواب دینا۔"

میں نے کہا: "مجھے میری ماں نے جنم دیا ہے اس لیے میں عورت کا بچہ ہوں۔ اگر تم مرد کے بچے ہو تو دنیا میں ایک ہی نمونہ ہو۔"

میں اس کے پاس سے گزرتا ہوا کوریڈور میں آیا۔ اس کے آخری سرے میں بائیں طرف ہمارے ڈائریکٹر جنرل کا کمرا تھا۔ میں نے دستک دی۔ آواز آئی: "چلے آؤ۔"

میں دروازہ کھول کر اندر گیا۔ انھیں سلام کیا۔ انھوں نے کہا: "بیٹھو۔"

میں سر جھکا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے گھورتے جا رہے تھے۔ پھر انھوں نے پوچھا: "یہ ماجدہ کا کیا چکر ہے؟"

"سر! میں قاتل کو چکر میں لا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کرتے ہوئے کہا: "تمھاری حالت تو پہلے سے زیادہ بگڑ گئی ہے۔ لگتا ہے تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ دن میں دس سے زیادہ سگریٹ نہ پینا۔"

مریض نے آہ بھر کر کہا: "میں تو دس سگریٹ بھی بڑی مشکل سے پیتا ہوں۔ آپ کی ہدایت سے پہلے تو میں سگریٹ کے قریب تک نہیں جاتا تھا۔"

شاہد پرشاد

"جمشید نے رپورٹ دی ہے کہ تم اس کیس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہو۔"

"سر! وہ جمشید کی رپورٹ ہے میری نہیں۔"

"اپنی رپورٹ پیش کرو۔"

"سر! میں نے پہلے ہی دن کہا تھا کہ جمشید کو میرے ساتھ نہ لگائیں یا پھر یہ کیس صرف انھی کے حوالے کریں۔"

"اپنے اعتراضات کی معقول وجہ بیان کرو۔"

"وہ پرانا گھسا پٹا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے طور پر کام کرنا چاہتا ہے اور میرا لائن آف ایکشن کچھ اور ہے۔"

"میں تمھارا لائن آف ایکشن معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ وعدہ کریں کہ میں جو کہوں گا وہ بات اس کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔ کسی تیسرے کے کانوں تک نہیں پہنچے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔"

میں چپ رہا۔ انھوں نے پوچھا: "اب کیا ہوا؟"

"سر! کسی برخوردار کی طرح سر جھکا کر رپورٹ دیتے وقت عجیب سا لگتا ہے۔ میں کرسی سے اٹھنا چاہتا ہوں۔"

"اسٹینڈ اپ۔ تم نوجوانوں کے ساتھ یہی مشکل ہے۔ ایک ذرا ادب سے نہیں بیٹھ سکتے۔ فوج میں اور پولیس کے محکمے میں ڈسپلن بہت ضروری ہے۔ یہاں کے آداب کا خیال رکھنا پڑتا ہے مگر تم سے نہیں ہو گا۔ چلو اٹھو کیا کہنا چاہتے ہو جلدی کہو۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی سے ذرا دور چلا گیا۔ پھر بولا: "آپ ناراض نہ ہوں۔ میرا لائن آف ایکشن بالکل جدا ہے۔ میں آج رات ماجدہ سے اسی کمرے میں ملنے والا ہوں۔"

انھوں نے غور سے دیکھا۔ پھر کہا: "ہوں، جمشید نے صحیح رپورٹ دی ہے۔ تم دن میں ملتے ہو لیکن یہ معاملہ رات کے اندھیرے تک پہنچ گیا ہے۔ تمھیں میرے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ کیا یہی تمھاری لائن آف ایکشن ہے؟"

"جی ہاں، میں اسی طرح قاتل کو پہچان سکوں گا۔"

"آخر کس طرح پہچانو گے؟"

"میں یہ آزمانا چاہتا ہوں کہ جب ماجدہ رات کے دو بجے یا تین بجے میرے پاس خالی کمرے میں آئے گی یا کمرے تک پہنچنے کے لیے مجھے روکنے والا کوئی نہیں ہو گا تو کیا میں خود اپنے ضمیر کی آواز پر رک سکتا ہوں؟"

"تم کسی قاتل کے خلاف ثبوت حاصل کرنے جا رہے ہو یا خود کو پارسا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"سر! اس کیس میں پارسائی ایک اہم نکتہ ہے۔ آپ کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یاد ہو گی۔ اس میں صاف طور سے لکھا ہوا ہے کہ رسّی کا پھندا لگا کر مرنے والی خالدہ آخری وقت تک پارسا تھی۔ کسی نے اس کے جسم کو بری نیت سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جب کہ وہ آدھی رات کے بعد اپنے کسی عاشق سے ملنے اس خالی کمرے میں گئی تھی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس خالی کمرے میں وہ عاشق کس طرح پارسا رہ گیا۔ وہاں کیسے حالات تھے کہ اس کی نیت خراب نہیں ہوئی۔ آخر کن حالات میں ایک مرد کی نیت خراب نہیں ہوتی۔ مجھے ان حالات کو ہر حال میں سمجھنا ہے۔"

"تم اس کیس کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہو۔ چلو مان لیتا ہوں کہ تمھارا یہ نکتہ بہت اہم ہے۔ اگر تم پارسا رہ گئے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ اور اگر پارسا نہ رہے تو اپنی حرکت کا کیا جواز پیش کرو گے؟"

"سر! حالات میں خود سمجھنے جا رہا ہوں۔ اس کا جواب ابھی کیسے دے سکتا ہوں۔"

وہ مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بھی اپنی ریوالونگ چیئر پر گھومتے ہوئے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے پوچھا: "کیا تم اسی خالی کمرے میں لڑکی سے ملو گے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا تم اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہے ہو؟"

"میرے پاس ایک ریوالور ہو گا۔"

"صرف ایک ریوالور سے کیا ہو گا۔ اپنے ساتھ کچھ آدمی لے جاؤ۔"

"اس طرح قاتل کو ہوشیار کر دینے والی بات ہو گی۔ میں تنہا جاؤں گا۔ میں نے پہلے ہی آپ سے درخواست کی ہے کہ یہ بات اس کمرے سے باہر نہ جائے۔ کسی تیسرے کو معلوم نہ ہو۔"

"یہ بات یہاں سے باہر نہیں جائے گی۔ مجھے قاتل چاہیے۔ اگر تم اسے گرفتار نہ کر سکے تو ہماری بڑی بدنامی ہو گی۔"

"سر! کبھی کامیابی ہوتی ہے کبھی ناکامی۔ اس میں بدنامی کی کیا بات ہے؟"

"تم ذرا اپنی لائن آف ایکشن پر غور کرو۔ تم ایک جوان لڑکی سے ملنے جا رہے ہو۔ اگر قاتل ہاتھ نہ آیا اور تم اس لڑکی کے ساتھ پکڑے گئے تو کیا ہماری نیک نامی ہو گی؟"

"آپ کی اس بات کا جواب دینے کے لیے مجھے ایک کاغذ اور قلم چاہیے۔"

"یہاں سب کچھ ہے۔ کیا لکھنا چاہتے ہو؟"

میں نے کاغذ اٹھایا۔ اس پر ملازمت سے مستعفی ہونے کی ایک درخواست لکھی۔ پھر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اگر میں قاتل کو گرفتار کرنے میں ناکام رہوں اور اس جوان لڑکی کے ساتھ پکڑا جاؤں تو آپ پریس والوں کو میرا یہ استعفا دکھا کر کہہ سکتے ہیں کہ میرا آپ کے محکمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں پہلے ہی نوکری چھوڑ چکا تھا۔ اور اگر قاتل گرفت میں آ جائے تو میرا یہ استعفا ردی کی ٹوکری میں پھینک دیجیے گا۔"

وہ کبھی مجھے اور کبھی میری درخواست کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں سلام کر کے چلا آیا۔

وہ دن بڑی بے چینی سے گزرا۔ میں رات کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ عجیب سی حالت تھی۔ اسی حالت میں وہ دن گزر گیا۔ رات آئی پھر آدھی رات بھی گزر گئی۔ میں نے موجودہ موسم کی مناسبت سے لباس پہنا۔ ضرورت کی چیزیں

کھیں۔ پھر گھر سے نکل پڑا۔

تقریباً ڈیڑھ بجے میں اس گھر کے سامنے پہنچا۔ وہاں دروازے پر ابھی تک وہ تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا، مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔ وہ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا جس کمرے میں خالدہ پھندے سے لٹک کر مری تھی اس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ صحیح سلامت تھا۔ میں نے اس دروازے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا تو پتا چلا وہ اندر سے بند ہے۔ میں ٹوٹے ہوئے دروازے سے اس خالی کمرے میں آ گیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ اپنی آنکھوں کو اندھیرے کا عادی بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مکان کے سامنے والی سڑک پر بہت دور بجلی کا کھمبا تھا۔ وہاں ایک بلب روشن تھا۔ اتنی دور سے آنے والی روشنی اب محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے کے اندر کی کچی دیواریں جھلک رہی تھیں۔ لیٹنے کے لیے اس کمرے میں دری یا چٹائی تک نہیں تھی۔ کوئی اور سامان نہیں تھا۔

میں ڈیڑھ بجے چلا آیا تھا جب کہ ساجدہ سے دو بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ادھر وہ بھی بے چین تھی لیکن کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ نانی اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ باپ موجود نہیں تھا اس لیے وہ ٹھیک دو بجے پہنچ گئی۔ اس نے خود کو چادر میں چھپا رکھا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے سے فوراً اندر آ گئی تھی کہ باہر کوئی دیکھ نہ لے۔ اندر آتے ہی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھے بھٹکنے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سرگوشی میں مخاطب کیا۔ "ساجدہ؟"

وہ ایک دم سے گھبرا کر بولی۔ "آں؟"

"گھبراؤ نہیں، میں ہی ہوں۔"

میں اس کے قریب آ گیا۔ پھر اس کے بازو کو پکڑ کر دوسری طرف لے جانا چاہتا تھا مگر بھرے بھرے بازو گرفت میں لیتے ہی جیسے خود اسی کی گرفت میں آ گیا۔ میں بھول گیا کہ کیا چاہتا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اپنی قوت ارادی کو یاد کیا اور خود سے کہنے لگا۔ "میں بھٹکنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بھٹکنے والوں کو راہ راست پر لانے والا ہوں۔"

لیکن ایسے وقت دوسروں کی نصیحت کام نہیں آتی۔ پھر اپنے آپ کو کی جانے والی نصیحت بھلا کیا اثر کرتی؟ ویسے آدمی کے سنبھلنے میں قدرت کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی وقت مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کے پیچھے چلا گیا۔ ساجدہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ دروازے کے پاس ایک قد آور سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اچھا ہوا میں نے منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ ساجدہ سے کچھ نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ آ گیا تھا اور مجھے دروازے کے پیچھے چھپنے کا موقع مل گیا تھا۔

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر رات کے گہرے سناٹے میں رمضو قصائی کی سرگوشی ابھری۔ "میں جانتا ہوں تو یہاں ہے۔ بے حیا، بے شرم، اسی لیے لوگ بیٹی نہیں چاہتے۔ جس دن بیٹی پیدا ہو جائے اس دن کھانا نہیں کھاتے۔"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ابا! مجھے معاف کر دو۔"

"معافی بعد میں ملے گی۔ یہ بتا، وہ کہاں ہے؟"

وہ چپ رہی۔ رمضو نے پوچھا۔ "بتاتی ہے یا میں اُسے خود ڈھونڈ نکالوں؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "ابا! یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں۔"

"مجھے تو بتاتی ہے۔ اکیلی یہاں کیا کرنے آئی ہے؟"

"میں خالدہ باجی کی طرح یہاں مرنے آئی ہوں۔"

رمضو قصائی نے بڑی سفاکی سے کہا۔ "ابھی تیری خواہش پوری کروں گا۔ پہلے اس سے نمٹنا چاہتا ہوں۔"

"ابا! یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"یہ بھی اچھا ہے کہ وہ نہیں ہے۔ تو خاموش رہ۔ ایک آواز نہ نکال۔ جب بھی تیرا وہ عاشق آئے گا تو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ اسے پہلے اندر آنے دینا۔ پھر میں اُسے دبوچ لوں گا۔"

وہ اندر آ گیا تھا۔ دروازے سے سر نکال کر کبھی کبھی باہر دیکھ لیتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ساجدہ سے پوچھا۔ "اس نے کب آنے کا وعدہ کیا تھا؟"

"ابا! ایسی باتیں نہ پوچھو۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

"ایسی ہی شرم والی ہوتی تو یہاں نہ آتی۔ اچھا ہوا کہ آج تو بھی آ گئی۔ آج دونوں بیٹیوں کی طرح تیرا بھی قصہ تمام کر دوں گا۔ پھر مجھے کوئی بیٹیوں کا باپ کہہ کر اپنے دباؤ میں نہیں رکھے گا۔ برادری کے پنچ میرے خلاف کبھی فیصلہ نہیں سنائیں گے۔ دوسری بیوی سے دو بیٹے پیدا ہو گئے ہیں۔ اب میں سر اٹھا کر برادری کے پنچوں سے اپنی مرضی کا فیصلہ کراؤں گا۔۔۔ کیونکہ میں بھی بیٹوں والا ہوں۔"

ساجدہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "ابا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمھاری بیٹی ہوں۔ کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، میں اپنے گھر سے بیٹی نام کی چیز کو فنا کر دینا چاہتا ہوں۔"

"کیا تم غصے میں ایسا کہہ رہے ہو یا سچ مچ تم نے میری ساجدہ آپا اور خالدہ باجی کو بھی مار ڈالا ہے؟"

"ہاں ہاں، مار ڈالا ہے۔ اپنے ان ہاتھوں سے مار ڈالا ہے۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پلٹ کر باہر دیکھا۔ پھر گہری سرگوشی میں بولا۔ "آواز نہ نکالنا۔ شاید کوئی آ رہا ہے۔"

اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز دور سے آئی۔ ہمارے قریب سے ہوتی ہوئی گزری پھر دور چلی گئی۔ محلے کا کوئی آدمی ہوگا جو اپنے گھر جا رہا ہوگا۔ بہرحال وہ گزرنے والا جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد رمضو قصائی نے آہستہ آہستہ ساجدہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس آ، دیکھ میرے ہاتھ میں بغدا ہے۔ اس بغدے سے جانوروں کا قیمہ بناتا ہوں اور ہڈیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ یہ اس رات بھی میرے ہاتھ میں تھا جب خالدہ یہاں کسی سے ملنے آئی تھی لیکن میں نے بغدے سے اس پر حملہ نہیں کیا۔ اگر میں اُسے قتل کرتا تو پکڑا جاتا۔ سب سمجھتے کہ ذات کا قصائی ہوں۔ میں ہی قتل کرنے کے لیے ایسا ہتھیار استعمال کر سکتا ہوں۔ لہٰذا میں نے اسے استعمال نہیں کیا۔ آج بھی نہیں کروں گا۔"

ساجدہ نے کہا۔ "ابا! میں تیری بیٹی ہوں۔ بزدل نہیں ہوں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد میں زندہ رہنا نہیں چاہتی کہ میری دو بہنوں کا قاتل میرا باپ ہے۔"

میں دروازے کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ اب اندھیرے میں اس حد تک دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا کہ ان دونوں کو کسی حد تک دیکھ سکتا تھا۔ رمضو آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی بیٹی کے پیچھے گیا پھر پیچھے سے ہی ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچ لی۔

میں نے چند لمحوں تک انتظار کیا کہ وہ کچھ اور بولے اور میرا انتظار رائیگاں نہیں گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں کس دل سے ایسا کرتا ہوں یہ میرا خدا جانتا ہے۔ میں نے تیری بہن کو بھی اسی طرح گلا دبوچ کر مار ڈالا۔ پھر اُسے پھندے سے لٹکا دیا تاکہ پولیس والے اسے خودکشی کا کیس سمجھ لیں۔ گلا گھونٹنے سے اس کا دم نکلا تھا۔ پھانسی میں بھی یہی ہوتا ہے۔"

میں نے اور انتظار نہیں کیا۔ یقیناً ساجدہ کا دم گھٹ رہا ہوگا۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکال کر یکبارگی روشنی کر دی۔ وہ ایک دم سے بڑبڑا گیا۔ اس کے ہاتھ سے ساجدہ کی گردن نکل گئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں وہ بغدا دکھائی دے رہا تھا جس کی وہ تعریف کر چکا تھا۔ وہ۔۔ چوڑے پھل کا چھرا قیمہ بنانے اور ہڈیاں توڑنے کے کام آتا تھا۔ اچانک درندے کی طرح چیختا ہوا مجھ پر حملہ کرنے کے لیے تیزی سے دوڑتا ہوا آیا۔ میں نے فوراً ٹارچ بجھا دی اور ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ بے تحاشا دوڑتا ہوا گیا۔ پھر دیوار سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پھر ٹارچ روشن کر دی۔

وہ غصے اور جنون میں کہہ رہا تھا۔ "میں نہیں چھوڑوں گا۔ میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ جان سے مار ڈالوں گا۔"

وہ پھر پلٹ کر غراتا ہوا آیا۔ میں نے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر گولی چلائی۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ گولی اس کی کلائی میں لگی تھی۔ بغدا چھوٹ کر فرش پر آ گیا۔ میں نے کہا۔ "رمضو! میں یہاں بری نیت سے نہیں آیا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ خالدہ کے پاس آنے والا شخص پارسا کیسے چلا گیا۔ اب معلوم ہو گیا کہ وہ آیا ہی نہیں تھا اور اگر آیا تھا تو تم نے اُسے مار کر بھگا دیا ہوگا یا وہ خود بھاگ گیا ہوگا۔ تمھارے بیان کے مطابق تم نے اپنی خالدہ بیٹی کو اسی طرح ایک ہاتھ سے گردن دبوچ کر مار ڈالا۔ پھر اسے پھندے سے لٹکا دیا۔ میڈیکل رپورٹ نے مجھے چونکا دیا تھا کہ پھانسی پر لٹکنے والی لڑکی پارسا تھی۔ کسی نے اس کی عزت پر حملہ نہیں کیا تھا۔ تب میں نے سوچا، یہ کیسے ممکن ہے۔ رات کی تنہائی میں جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ آخر ایسے کون سے حالات تھے کہ جوانی دیوانی نہیں ہوئی بلکہ پارسائی کا ثبوت دے کر چلی گئی۔

ٹارچ کی روشنی رمضو پر تھی۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ اور اپنا دوسرا ہاتھ آہستہ آہستہ بغدے کی طرف بڑھا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "رمضو! ایسی کوشش نہ کرو۔ میں نے اسی دن سمجھ لیا تھا کہ تم نے اپنی بیٹی کو ہلاک کیا ہے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مرد ذات ہی خود غرض ہوتا ہے۔ رات کی تنہائی ہو اور صنف مخالف سامنے ہو تو اس کی خود غرضی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب سامنے بہن یا بیٹی کا رشتہ ہوتا ہے۔ اسی لیے تمھاری دو بیٹیاں بڑی پارسائی سے اٹھ گئیں۔ آج یہ بیٹی بھی اٹھنے والی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم وقت پر آ گئے اور میری پارسائی کا بھی بھرم رہ گیا۔"

رمضو نے کہا۔ "جب تم سب کچھ سمجھ چکے ہو تو میں تمھیں اپنی بہت سی مجبوریاں بتاؤں گا لیکن خدا کے لیے مجھے تھوڑا سا موقع دو۔ میں اس بیٹی کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنے سر سے میلا پالا اتار دینا چاہتا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے اچانک ہی بغدے کو اپنی گرفت میں لیا۔ پھر اسے ساجدہ کی طرف کھینچ کر مارنا چاہتا تھا۔ میں نے پھر گولی چلا دی۔ اس بار نشانہ خطا ہوا لیکن وہ بھی گولی چلنے کی آواز پر گڑبڑا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے چلنے والا بغدا ساجدہ کو نہیں لگا۔ وہ بال بال بچ گئی۔

میں نے کہا۔ "تم ایک زخمی درندے کی طرح ہو۔ کسی بھی طرح قابو میں نہیں آؤ گے۔ میرے پاس ہتھکڑی بھی نہیں ہے۔ تمھیں بے بس کرنے کا بس ایک راستہ ہے۔"

وہ فرش پر سے اٹھ رہا تھا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ پر گولی ماری۔ وہ پھر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اسی وقت ساجدہ دوڑتی ہوئی آئی۔ میں سمجھا میرے پاس آ رہی ہے لیکن وہ قریب سے گزر گئی۔ دروازہ کھول کر باہر کی طرف بھاگ گئی۔ میں نے آواز دی۔ "ساجدہ! رک جاؤ۔"

پھر میں تیزی سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچا جہاں بغدا دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا تھا۔ میں نے اسے اپنے قبضے میں لیا۔ پھر اسی طرح دوڑتا ہوا ٹوٹے ہوئے دروازے سے نکل کر باہر آیا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ ساجدہ نظر نہیں آئی۔ تب میری سمجھ میں آیا، وہ اپنی بدنامی کے ڈر سے چلی گئی ہے۔ بے شک بدنامی سے ڈرنا چاہیے لیکن ان حالات میں اس طرح نہیں جانا چاہیے۔

میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اندھیرے کمرے کی طرف دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے کے پیچھے سے رمضو قصائی کے کراہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں پھر اندر آیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی ٹانگ کو دیکھا۔ اس کی شلوار لہو میں بھیگ رہی تھی۔ میں نے جھک کر اس کی ٹانگ کو ہاتھ لگایا تو وہ ایک دم سے تڑپ کر چیخنے لگا۔ میں سمجھ گیا گولی آر پار نہیں ہوئی تھی۔ ٹانگ میں پیوست ہو گئی تھی جس کی تکلیف اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر تیزی سے چلتا ہوا مکان کے دوسرے حصے میں آیا۔ دروازہ بند نظر آ رہا تھا لیکن جب میں نے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ اندر اس کی نانی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "بیٹی! تم کچھ بولتی کیوں نہیں ہو۔ میں نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی ہیں۔ میری

ایک دم سے گھبرا گئی تھی۔ دیا لگا جیسے اپنے ہی گھر میں گر گیا ہو چل
دی تھی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا ساجدہ کے کمرے میں آیا۔ بڑی بی نے
مجھے دیکھا۔ پھر کہا: "یہ کیا حرکت ہے۔ تم بغیر اجازت کیوں
آئے ہو؟"
"ان حالات میں اجازت ضروری نہیں ہوتی۔ ساجدہ میرے
ساتھ چلو۔"
وہ بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر
رونے لگی۔ پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی: "میں نہیں جاؤں گی۔ میں
کہیں بھاگ جاؤں گی۔"
"احمقانہ باتیں نہ کرو۔ تمھیں نے کیا بتا رہی ہیں قاتل کو گرفتار کر دوں گا
جب وہ گرفتار ہو گا تو صدمہ کیوں ہوتی ہو کیا قاتل صرف بیٹے اور مجرم
ہوتے ہیں۔ کیا باپ اور بھائی قتل نہیں کرتے؟"
میں نے کھینچ کر وہاں سے اُٹھایا۔ خاتون نے کہا: "ارے
اسے کیا کر رہے ہو۔ میری بچی کا ہاتھ کیوں پکڑ رہے ہو؟"
میں نے کہا: "خاتون! آپ خاموش رہیں۔ حالات بہت نازک
ہیں۔ اگر میں نے آپ کی نواسی کو چھوڑ دیا تو یہ اپنے باپ کے ہاتھوں
قتل ہو جائے گی۔ اس کی ٹانگ نے اسے بے بس کر دیا ہے لیکن وہ بڑا
ہی [illegible] ہے۔ کسی وقت بھی ساجدہ کے پاس پہنچ سکتا ہے۔ میں پہلے
اسے حوالات پہنچاؤں گا اس کے بعد ساجدہ کو آپ کے پاس لا کر
چھوڑوں گا۔"
میں اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ پھر میں نے باہر آ کر دو بار
آسمانی فائرنگ کی۔ محلے کے کتنے ہی لوگ پہلے ہی دو بار فائرنگ کی
آواز سن کر چونک گئے تھے۔ اب گھروں اور دروازے کھل رہے تھے۔
میں نے بلند آواز سے کہا: "محلے والو! سنو! میں پولیس والا ہوں۔
یہاں ایک قاتل پکڑا گیا ہے۔ مجھے تم میں سے کچھ لوگوں کی ضرورت ہے
جلدی آؤ۔"
تھوڑی دیر میں ہی محلے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ میں نے کچھ لوگوں
کو کہا: "اس کمرے میں رمضو قصائی زخمی پڑا ہے۔ اسے باہر نکلنے نہ دو۔
ابھی پولیس والے آتے ہی ہوں گے اور اسے پکڑ کر لے جائیں گے۔"
میں ساجدہ کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً بھاگتا ہوا گلی کے فاصلے تک گیا وہاں
میں نے اپنی گاڑی چھوڑ دی تھی۔ اسے گاڑی میں بٹھا کر قریبی پولیس
اسٹیشن لے گیا۔ وہاں میں نے تھانہ انچارج کو مختصر سی روداد سنائی۔ اُسے
سپاہیوں کے ساتھ وہاں جا کر رمضو قصائی کو حراست میں لینے کے لیے
کہا۔ وہ فوراً میری ہدایات پر عمل کرنے چلا گیا۔ میں نے تھانے کے منشی
کو بلایا۔ پھر اس سے کہا: "یہ ساجدہ بی بی ہیں۔ ان کا بیان لو اور ان سے
دستخط کرا لو۔"
پھر میں نے ریسیور اُٹھا کر ڈائریکٹر جنرل کے نمبر ڈائل کیے۔ انھیں
قاتل کے گرفتار ہونے کی خوشخبری سنائی۔ انھوں نے حکم دیا: "رمضو قصائی
کو فوراً اسپتال پہنچا کر اس کی ٹانگ سے گولی نکالی جائے اور جب
تک وہ اسپتال میں رہے اُسے سخت پہرے میں رکھا جائے۔"
میں نے ساجدہ کو اس کے گھر واپس پہنچا دیا اور کہا: "تم نے اپنا
بیان دیا ہے۔ اب تمھاری گواہی کی ضرورت ہو گی لہٰذا اپنے گھر سے کہیں
بھاگنے کی حماقت نہ کرنا۔"
میں اسے سمجھا کر چلا آیا۔ رمضو کی ٹانگ سے گولی نکل چکی تھی۔ وہ
جنون میں مبتلا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد بار بار چیختا تھا: "مجھے جانے دو
ایک بار مجھے اپنی آخری بیٹی کا فرض ادا کر لینے دو۔ میں اسے بھی عزت کے
ساتھ رخصت کرنا چاہتا ہوں اور بیٹیوں کو عزت آبرو کے ساتھ اس
دنیا سے رخصت کر دینا چاہیے۔"
ڈائریکٹر جنرل نے مجھ سے پوچھا: "تمھیں کیسے یقین تھا کہ قاتل
ضرور آئے گا؟"
"جناب! میں کہہ چکا ہوں کسی جوان اور خوب صورت لڑکی کو
پارسائی سے قتل کرنے والا باپ اور بھائی ہو سکتا ہے ورنہ مرد، مرد
ہوتا ہے۔ بالکل ہی فرشتہ نہیں ہوتا۔"
انھوں نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا:
"سچ بتاؤ کیا تم ساجدہ کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھے؟"
"سر! وہ قصائی کی بیٹی ہے۔ اس کے ساتھ سنجیدہ ہونے کا
مطلب یہ ہوتا کہ شادی کی جائے۔ شادی میں بہت زیادہ مطالبہ کرتا
تب بھی اس کا باپ کہتا گوارا نہیں ہے کہ جہیز میں اپنی بیٹی کو ایک
بغدا دے۔ سر! بغدا قصائی کے اس چوڑے پھل والے چھرے کو
کہتے ہیں جس سے قیمہ بنایا جاتا ہے اور ہڈیاں توڑی جاتی ہیں۔ کیا آپ
چاہتے ہیں کہ قصائی کی بیٹی جہیز میں بغدا لے کر میرے گھر آئے۔ جب کہ
عورت اس کے بغیر بھی مرد کا قیمہ کر دیتی ہے۔"
رمضو قصائی کی ٹانگ کا زخم بھرنے میں تقریباً دو ماہ لگ گئے۔
اگر وہ سکون سے رہتا تو جلدی زخم بھر جاتے لیکن وہ رہ رہ کر جنون میں
مبتلا ہو جاتا تھا۔ ایک بار اسپتال سے اور دوسری بار حوالات سے بھاگنے
کی کوشش کی اور ہر بار یہی کہتا رہا کہ مجھے فرض ادا کر لینے دو۔
دو ماہ بعد پتا چلا "ساجدہ کہیں بھاگ گئی ہے۔ میرے سمجھانے
کا اثر نہیں ہوا۔ پتا نہیں کس عاشق کے ساتھ چلی گئی تھی۔ جب یہ بات
رمضو کو معلوم ہوئی تو وہ جنون میں مبتلا ہو گیا۔ آہنی سلاخوں کو مٹھی میں
پکڑ کر اسے جھنجھوڑ کر مجھے گالیاں دینے لگا: "ابے او جاسوس کے بچے!
کیا یہی تیرا قانون ہے کہ چار دیواری میں بیٹیوں کا تحفظ نہ ہو سکے۔ کیا
ایسے جوانوں کے لیے کوئی سزا نہیں ہے جو پاکستانی لڑکی کی چادر کو
تار تار کر کے [illegible] والی چادر کو سنبھالنے چلے جاتے ہیں۔ کیا ایسے [illegible]
کے لیے کوئی سزا نہیں ہے جو برادری کے دولت مندوں کے دباؤ میں
آ کر فیصلے بدل دیتے ہیں۔ ہمارا حقہ پانی بند کر دیتے ہیں۔ ہمارے گھر

سے بیٹیوں کا رشتہ مانگنے پر پابندی عائد کر دیتے ہیں تاکہ ہماری بیٹیاں
نہ گھر کی رہیں نہ گھاٹ کی۔"
وہ آہنی دروازے کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا: "ہماری برادری میں ایسے میں
کیا کہہ دیتا، بھری برادری میں اپنی زبان سے یہ کہتا کہ میری بڑی
بیٹی ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس کی شادی ضروری ہے۔
جب یہ جنون میں آ کر کپڑے پھاڑ پھاڑ کر چیختی ہے، اپنے بال نوچتی ہے
تو باپ کی غیرت مند آنکھیں جوان بیٹی کو اس حالت میں دیکھ نہیں سکتیں
اور جب وہ دیکھ نہیں سکیں تو میں نے اس پر پٹرول چھڑک دیا اور آگ
لگانے کے لیے بھیجا تو وہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔"
پھر وہ چیخ کر بولا: "میں مجرم نہیں ہوں۔ میں باپ ہوں۔ میں نے
اپنی بیٹی کو ہسٹیریا کے مرض سے نجات دلائی ہے اور نجات دلانے کا
اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔"
وہ آہنی سلاخوں کے پاس سے ہٹ گیا۔ لنگڑاتا ہوا دوسری
طرف گیا۔ پھر دیوار کے پاس پہنچ کر وہاں سے پلٹ کر بولا: "جب ساجدہ
چار برس کی تھی تو ان کی ماں مر گئی تھی۔ میں نے تینوں بیٹیوں کو ماں بن
کر پالا۔ میں وہ باپ ہوں جو ان کے بچپن سے لے کر جوانی تک
راتوں جاگتا رہا۔ یہ سمجھتے تھیں کہ میں دوسری شادی کرنے کے بعد اپنی
دوسری بیوی کے پاس جا کر رہتا ہوں لیکن نہیں، میں دوسری بیوی
کے پاس جاتا ضرور تھا لیکن رات کو پھر واپس آ جاتا تھا۔ میں نے مکان
کے دوسرے حصے میں تختی لگا دی تھی کہ مکان کرائے کے لیے خالی
ہے لیکن جو بھی آتا تھا میں اسے ٹال دیتا تھا۔ اس مکان کو کرائے پر
اٹھنے نہیں دیتا تھا کیوں کہ میں راتوں کو چپ چاپ آ کر وہاں کبھی
سوتا تھا کبھی بیٹھتا تھا۔ کبھی بار بار اُٹھ کر مکان کے دوسرے حصے میں
جا کر اپنی بیٹیوں کو دیکھتا تھا کہ کہیں کوئی میری عزت پر ڈاکا ڈالنے تو نہیں
آ رہا ہے۔ مکان کا وہ حصہ جو کرائے کے لیے خالی ہے در اصل خالی
نہیں ہے۔ وہاں ایک چوکیدار باپ رہتا تھا۔"
وہ کہتے کہتے ہانپنے لگا۔ پھر لنگڑاتے ہوئے آہنی دروازے کے
پاس آتے ہوئے بولا: "میں نے ایک رات اپنی دوسری بیٹی خالدہ کو دیکھا
وہ اپنے کمرے سے نکل کر مکان کے اس حصے سے گھوم کر خالی حصے
میں آ رہی تھی۔ تب میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔
جب وہ خالی کمرے میں آئی تو اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ میں نے اچانک
چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ اس کے حلق سے
چیخ نکلی۔ اچھا خاصا تگڑا جوان تھا۔ میرے قابو میں نہیں آ سکا۔ تڑپ کر
نکل گیا۔ پھر وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ پلٹ کر واپس نہیں آیا۔ آخر میں نے
خالدہ کی گردن دبوچ لی۔"
اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "آہ! جب میں نے اپنی بڑی
بیٹی کو ہسٹیریا کے مرض میں دیکھا اور برادری والوں نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا
تو میں نے سوچا بڑی بیٹی مجنون ہو چکی ہے۔ ایک تو برادری والوں نے
رشتے پر پابندی لگا دی کہ کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ دوسرے
یہ ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ اس کی چیخیں محلے میں دور تک جاتی ہیں۔
مجھے ننگے پن کا احساس ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی ہوتا ہو گا۔ اگر یہی
حالت رہی تو میری دو بیٹیوں کا رشتہ نہیں آئے گا۔
اسی لیے میں نے پہلی کو ختم کر دیا لیکن کچھ عرصے بعد دوسری نے
بھی مجھے بدنامی کا خوف دلایا۔ میں نے سوچا آج یہ لڑکا میرے ہاتھ سے
نکل کر بھاگ گیا ہے۔ کل خالدہ کو موقع ملے گا تو یہ اس کے ساتھ بھاگ
جائے گی۔ پھر میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا اور اس کی وجہ سے میری
تیسری بیٹی ساجدہ کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا لہٰذا میں نے اس کی
گردن دبوچ لی۔ اسے مار ڈالا۔ پھر اپنے ہی ہاتھوں سے شہتیر میں
رسیاں باندھیں۔ اس کا پھندہ بنایا۔ اپنی مردہ بیٹی کو کاندھے پر بٹھا کر
اس کے گلے میں پھندہ ڈال دیا۔ یہ میں نے کیا۔ میں باپ ہوں۔ جب
یہ بچی تھی تو میں اسے ایک بار کاندھے پر بٹھا کر داتا صاحب کے میلے
میں لے گیا تھا اور آج میں نے اسی بیٹی کو کاندھے پر بٹھا کر پھندے
سے لٹکا دیا۔ میری بیٹی کو داتا صاحب کے دربار سے پھانسی کے پھندے
تک پہنچانے والے کون ہیں؟ کیا انھیں سزا نہیں ملے گی؟"
پھر اس نے دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھا۔ میری طرف انگلی
اُٹھا کر کہا: "ابے او جاسوس کے بچے! کیا تجھے سزا نہیں ملے گی؟ تو قانون
کا محافظ کہلاتا ہے اور میری بچی سے ملنے کے لیے رات کے اندھیرے
میں آیا تھا اور جب پکڑا گیا تو الٹا مجھے گولی مار دی۔ مجرم تو تھا۔ مجھے
مجرم بنا دیا۔ ایک باپ کو مجرم بنا دیا جو اپنی بیٹی کو عزت آبرو سے
اُٹھانا چاہتا ہے۔ مگر اب کیا ہو گا۔ بول اب کیا ہو گا۔ ساجدہ بھاگ گئی ہے۔
اب وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جائے گی۔ اگر تو مجھے موقع دیتا
اور میں اسے مار ڈالتا تو وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک نہ پہنچتی۔ تو بتا سکتا ہے
اس وقت وہ کہاں ہو گی۔ کس حالت میں ہو گی۔ کس طرح اس کی عزت کی
دھجیاں اڑائی جا رہی ہوں گی۔ ہائے ہائے..."
وہ ہائے ہائے کہتے ہوئے اپنا سر آہنی سلاخوں سے ٹکرانے لگا۔
میں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا: "اسے پکڑو۔ زخمی نہ ہونے دو۔"
سپاہی دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ اسے پکڑ کر وہاں سے ہٹانے
لگے لیکن وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "خدا
کے لیے ایک نیکی کرو۔ مجھے ایک بار میری بیٹی سے ملا دو۔ میں بڑی
محبت سے پیار سے اس کا گلا دبا دوں گا۔"
میں گم صم کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بس یہ دیکھ سکتا تھا۔ ہمارا قانون،
ہماری تہذیب اور ہمارا طریقہ کار یہی ہے کہ ہم صرف مجرم کو پکڑتے ہیں۔
جرم کے اسباب کو کبھی پکڑ نہیں سکتے۔ اور اگر کبھی سمجھ میں آ جائیں تو ختم نہیں کر سکتے۔